www.Digestkahani.pk

انیلا کرن

سرگوشی ایسی ہوئی اکثر

وہ گھر میں داخل ہوا تو ہر طرف پھیلے ہوئے سناٹے نے اس کا استقبال کیا۔ اسے حیرت ہوئی اگرچہ رات ہو چکی تھی مگر ابھی اتنا بھی ٹائم نہیں ہوا تھا کہ سب سو ہی جاتے اور خصوصاً "امی جان" کے سونے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ خضر رات کو کتنی ہی دیر سے کیوں نہ آتا وہ ہمیشہ اس کے انتظار میں جاگ رہی ہوتی تھیں۔

صحن سے گزرتے ہوئے اس نے ایک نظر کچن پر ڈالی جہاں اس وقت تاریکی کا راج تھا پہلے جب وہ اس

مکمل ناول

وقت گھر پہنچتا تھا تو امی جان ہمیشہ کچن میں ہی ہوتی تھیں۔ کبھی برتن دھوتے ہوئے کبھی کسی کے لیے روٹی پکاتے ہوئے اور کبھی ابا جی اور ان کے دوستوں کے لیے چائے بناتے ہوئے جو "عموماً" رات گئے تک بیٹھک میں ڈیرہ ڈالے رکھتے تھے۔

ابا جی مقامی کالج میں انگلش کے پروفیسر تھے اور کتابوں سے گہرا شغف رکھنے کی بنا پر ہم ذوق لوگوں میں کافی مقبول تھے۔ کبھی کبھی خضر کو ان کی اس مقبولیت پر حیرت بھی ہوا کرتی تھی۔

"بھلا جو بندہ کچھ بولتا ہی نہ ہو اس کے پاس بیٹھنے سے کیا حاصل۔" وہ اکثر حیران ہو کر سوچا کرتا۔

ابا جی اتنے کم گو تھے کہ بعض اوقات خضر ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو باقاعدہ گنا کرتا تھا۔ خیر بہت باتونی تو ان کے گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ خود خضر بہت کم بولتا تھا مگر ابا جی کی کم گوئی تکلیف دہ حد تک زیادہ تھی۔ اسے یاد نہیں تھا کہ کبھی ابا جی نے اس سے پورے دن میں تین چار فقرے بھی بولے ہوں۔ حالانکہ جب اس نے کالج میں داخلہ لیا تو اس کے اندر نہ جانے کہاں سے یہ خواہش پیدا ہو گئی تھی کہ اس کی ابا جی سے دوستی ہو تب اس نے بارہا کوشش بھی کی کہ ابا جی اس سے باتیں کریں مگر اس کی یہ کوشش ابا جی کے اختصار نے بری طرح سے ناکام بنا دی۔ ایک تو اسے خود بھی زیادہ گفتگو کرنی نہیں آتی تھی اور جتنی گفتگو وہ پوری کوشش صرف کر کے کرتا ابا جی اس پر بھی زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے اور خود صرف وہاں بولتے تھے جہاں بولنا ناگزیر ہو جایا کرتا تھا۔

دو ماہ تک ایسی کوششیں کر کے خضر خود ہی اپنی خواہش سے تائب ہو گیا اور دوبارہ سے اپنے خول میں سمٹ گیا۔ پھر بھی گھر بھر میں اگر کوئی اعتماد سے ابا جی کے سامنے بول سکتا تھا تو وہ خضر ہی تھا۔ ورنہ باقی سب تو ابا جی سے اتنا ڈرتے تھے کہ ان کی پوری کوشش ہوا کرتی تھی کہ ابا جی سے مخاطب ہی نہ ہونا پڑے۔ حتیٰ کہ خضر سے دو سال چھوٹا ناصر بھی ابا جی سے دور دور ہی رہتا تھا۔ حالانکہ ابا جی نے انہیں شاید ہی کبھی ڈانٹا ہو مگر ان کی خاموشی اور لاتعلقی کا ان سب بہن بھائیوں پر ایسا رعب پڑا تھا کہ وہ ان سے عام سی بات بھی نہیں کر پاتے تھے اور خود امی جان بھی ابا جی سے بہت خائف رہا کرتی تھیں۔ جب تک ابا جی گھر میں رہتے گھر بھر پر سناٹا چھایا رہتا۔ جس کا بچپن سے عادی ہونے کے باوجود خضر کو یہ سناٹا بہت تکلیف دہ لگا کر

تھا۔

اس وقت بھی گھر پر ایسا ہی سناٹا طاری تھا مگر خضر کو حیرت اس بات پر تھی کہ اس ٹائم ابا جی ہمیشہ ہی گھر کی بیرونی جانب بنی بیٹھک میں ہوا کرتے تھے۔ جہاں یا تو ان کے دوست احباب میں سے کوئی نہ کوئی آیا رہتا تھا یا پھر وہ خود ہی رات گئے تک اپنے لکھنے پڑھنے کے کام میں مصروف رہا کرتے تھے کیونکہ ابھی رات کے آٹھ ہی بجے تھے اور ابا جی گھر کے اندرونی حصے میں گیارہ بجے سے پہلے نہیں آیا کرتے تھے۔

انہی سوچوں میں غلطاں وہ بڑے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو ابا جی اور ناصر کے علاوہ گھر کے تمام افراد وہیں موجود تھے۔ امی جان رضائی اوڑھے لیٹی تھیں۔ اس کی اکلوتی بہن نائمہ۔ نوٹس پھیلائے بیٹھی تھی اور سب سے چھوٹا خرم جو اپنے اسکول کا کام کر رہا تھا خضر نے اندر داخل ہو کر سلام کیا تو سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔

"آ گئے بیٹا!" اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے امی جان اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ خضر کو سامنے پا کر ان کے چہرے پر ہمیشہ ہی رونق آ جایا کرتی تھی۔ ان کے چاروں بچوں میں سے اگر کوئی صحیح معنوں میں ان کے قریب تھا تو وہ خضر ہی تھا وہ جب تک گھر میں رہتا اس کا زیادہ وقت امی جان کے قریب ہی گزرا کرتا تھا۔ اسکول کالج اور یونیورسٹی کی پڑھائی کے دوران وہ شام کا سارا وقت کچن میں ان کے قریب بیٹھا رہتا یا ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ اور اب بھی جب سے اس نے ایم ایس سی کمپیوٹر سائنس کے بعد ایک پرائیویٹ فرم میں جاب شروع کی تھی اور اس کے پاس وقت کی اچھی خاصی کمی ہو گئی تھی۔ وہ رات کو گھر آنے کے بعد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ امی جان کے پاس ضرور بیٹھا کرتا تھا۔

"کیا بات ہے آج گھر میں بڑی خاموشی ہے اور نائمہ نے ٹی وی بھی بند کر رکھا ہے۔ آج کوئی ڈراما نہیں آنا تھا؟"

امی جان کے قریب بیٹھتے ہوئے اس نے خوشگوار انداز سے پوچھا تھا۔ نائمہ ٹی وی ڈرامے دیکھنے کی از حد شوقین تھی اور ڈراما دیکھتے ہوئے وہ آس پاس کسی کو بولنے تک نہیں دیتی تھی۔

"شی، آہستہ بولیں ابا جی ساتھ والے کمرے میں سو رہے ہیں۔" اس کے سوال پر نائمہ نے تو سر بھی نہیں اٹھایا تھا البتہ خرم نے اسے ڈرانے والے انداز میں ابا جی کی موجودگی کا بتا دیا تھا۔

"کیا ہوا ابا جی کو؟ آج اتنی جلدی سو گئے۔" اس نے امی جان سے پوچھا۔

"بخار ہے دوائی کھا کر لیٹ گئے ہیں۔ تم کپڑے بدل لو میں کھانا لاتی ہوں۔"

امی جان اسے بتا کر کمرے سے باہر چلی گئیں خضر نے ایک نظر دونوں کمروں کے بیچ والے دروازے پر ڈالی جو اس وقت بند تھا۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا وہ اندر جا کر ابا جی کی طبیعت پوچھے مگر پھر ابا جی کا متوقع سرد رد عمل ذہن میں آیا تو وہ سر جھٹک کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے سب سے پہلے ماہ نور کو اپنے گھر پہنچنے کی اطلاع دینے کے لیے فون کیا۔

کیونکہ جب تک ماہ نور کو اس کے گھر پہنچنے کی تسلی نہیں ہو جاتی تھی وہ انتظار میں جاگتی رہتی تھی۔

ماہ نور کا نمبر ملاتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر خود بخود ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی اور بوجھل دل بھی جیسے پرسکون سا ہو گیا تھا۔

وہ ان دونوں بی ایس سی فورتھ ایئر میں تھا۔ ماہ نور اس کے کالج کے دنوں کے سب سے اچھے دوست معاذ کی چھوٹی بہن تھی معاذ کے ساتھ اگرچہ اس کی دوستی کو ڈیڑھ برس گزر چکا تھا مگر وہ کبھی اس کے گھر نہیں گیا تھا مگر اس روز کالج میں اچانک ہونے والی اسٹرائیک کی وجہ سے کوئی بھی کلاس نہیں ہو رہی تھی اس لیے معاذ اسے زبردستی اپنے گھر لے آیا۔ وہیں اس نے پہلی بار ماہ نور کو دیکھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں ایک صوفے پر براجمان تھی اس کے ہاتھ میں میرون جلد والی ڈائری تھی اور وہ بڑے انہماک سے اس پر کچھ لکھ رہی تھی جبکہ صوفے اور ٹیبل پر حتیٰ کہ کارپٹ پر بھی یہاں وہاں مختلف رسالے، میگزین اور کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ کتابیں ساری کی ساری شاعری اور افسانوں پر مشتمل تھیں اور ان افسانوی کتابوں اور رسالوں کے بیچوں بیچ وہ شکن آلود سفید لباس میں کہنیوں تک آستین الٹے اور شانوں پر سیاہ سلکی بال بکھرائے کم از کم خضر کو بڑی منفرد لگ رہی تھی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گیا۔

"اچھا تو تم کالج سے فرار ہو کر آئے ہو میں ابھی پاپا کو فون کر کے بتاتی ہوں۔" معاذ پر نظر پڑتے ہی وہ دھمکی آمیز انداز میں بولی تھی۔

"ہاں ہاں بتا دو اور اپنا بھی بتا دینا کہ گھر بیٹھی رسالے چاٹ رہی ہو۔"

"مجھے کالج سے چھٹیاں ہیں۔ اس لیے میں جو چاہوں کر سکتی ہوں۔"

وہ تنک کر بولی تھی۔ اس کے اس انداز پر خضر کو ہنسی آ گئی ماہ نور نے گھور کر اسے دیکھا۔ خضر کی موجودگی کا احساس اسے پہلی بار ہوا تھا۔ اسے معاذ کے دوست کبھی اچھے نہیں لگے تھے اس کے حساب سے وہ سب کے سب چھچھورے اور میز سے عاری ہوتے تھے اور ماہ نور بھی ان کا لحاظ نہیں کیا کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے کوئی سخت سا فقرہ کسنے کے لیے منہ کھولا تھا مگر خضر کی طرف دیکھ کر وہ اپنے فقرے کو لبوں کی قید سے آزاد نہیں کر سکی۔ دراز قامت اور سفید رنگت والے خضر کی شخصیت میں ایسا کچھ ضرور تھا کہ وہ اسے معاذ کے باقی دوستوں کی طرح دھڑلے سے نہیں ٹوک سکی۔

"اچھا اگر میری پیاری بہن آج فارغ ہے تو اپنے ہاتھ سے پکوڑے ہی بنا کر کھلا دے۔ آج بڑا دل کر رہا ہے تمہارے ہاتھ کے پکوڑے کھانے کو۔"

صوفے پر سے رسالے اور کتابیں اٹھاتے ہوئے معاذ کہہ رہا تھا۔

"ہوں سوچتی ہوں یہ تمہارے کوئی نئے دوست ہیں؟" کھڑے ہوتے ہوئے اس نے ناقدانہ نظروں سے خضر کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"یہ خضر ہے۔ میرا کالج کا دوست 'دوستی تو نئی نہیں ہے مگر گھر یہ پہلی بار آیا ہے اور خضر یہ میری اکلوتی بہن ماہ نور ہے۔ میڈیکل کے پہلے سال میں ہے۔" معاذ نے ان دونوں کا تعارف کروایا۔ ماہ نور کے میڈیکل اسٹوڈنٹ ہونے کا سن کر خضر کو حیرت ہوئی تھی اس نے آج تک میڈیکل کے کسی اسٹوڈنٹ کو اتنا ریلیکس نہیں دیکھا تھا کہ وہ لٹریری بکس اور رسالے پڑھے یا پھر اطمینان سے بیٹھ کر ڈائری لکھے۔ وہ حیران سا صوفے پر بیٹھ گیا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد جب ماہ نور گرما گرم پکوڑے، ہرے دھنیے اور دہی کی چٹنی اور چائے ساتھ لے کر آئی تو اس کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔ ماہ نور نے بہت مزے دار پکوڑے بنائے تھے اور اس کی بنائی چائے کا ذائقہ بھی خضر کو بہت منفرد اور اچھا لگا تھا۔

وہ انہیں چائے اور پکوڑے سرو کرنے کے بعد اندر چلی گئی مگر خضر بعد میں جتنی دیر بھی وہاں بیٹھا رہا اسے مسلسل ماہ نور کی موجودگی اپنے آس پاس محسوس ہوتی رہی وہ اس کی اب تک کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی۔ جس کے بارے میں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سوچے جا رہا تھا۔

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول
کوئی ایسا اہل دل ہو
نبیلہ عزیز
قیمت --- -/250 روپے
منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37- اردو بازار کراچی۔

www.pkdigest.com

اس رات وہ سونے کے لیے لیٹا تو آنکھیں بند کرتے ہی نہ جانے کہاں سے شکن آلود سفید لباس میں کہنیوں تک آستینوں کو فولڈ کیے لاپروا مگر بہت اعتماد سی ماہ نور اس کی بوجھل پلکوں کی دہلیز پر آکر بیٹھ گئی اور وہ بہت توجہ و محبت ـــ سے اسے دیکھے گیا۔

✲ ✲ ✲

دوسری بار وہ خضر کو ایک ہفتے کے بعد نظر آئی۔ معاذ کو موٹر سائیکل سے گر کر گرنے پر شدید چوٹ آگئی تھی اور وہ صاحب فراش تھا۔ خضر کو معلوم ہوا تو وہ اس کی عیادت کے لیے ان کے گھر چلا آیا۔

گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی اس کی پہلی نظر ماہ نور پر پڑی وہ لان میں گھاس پر بیٹھی تھی۔ اس کے ارد گرد بے شمار نوٹس اور کتابیں بکھری ہوئی تھیں اور وہ اپنے ہاتھوں میں ایک انسانی ہڈی پکڑے بڑے انہماک سے اس کا مطالعہ کر رہی تھی۔

"ایکسکیوزمی جی مجھے معاذ سے ملنا ہے۔"

چند لمحوں تک تو خضر اس سے کچھ کہہ ہی نہیں پایا تھا۔ بالکل سادہ گلابی لباس پہنے اپنے شانوں پر سیاہ ریشمی بال بکھرائے جن میں ہلکی ہلکی نمی تھی وہ اپنے دھلے نکھرے چہرے کے ساتھ خضر کو اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ اس کا دل ماہ نور کے چہرے سے نظر ہٹانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر وہ وہاں زیادہ دیر کھڑا بھی نہیں رہ سکتا تھا اس لیے مجبوراً "معاذ کے بارے میں پوچھنا پڑا۔

"تو ملیے میں نے کب روکا ہے۔" وہ سر اٹھائے بغیر تنک کر بولی تھی پھر جیسے اسے خود ہی کوئی احساس ہو گیا اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور خضر کو دیکھ کر گڑبڑا سی گئی۔

"او آپ آئم سوری... میں سمجھی... اصل میں معاذ کے دوست... آئیے میں آپ کو معاذ کے پاس لے چلتی ہوں۔" وہ کھڑی ہو گئی۔ خضر ہلکے سے مسکرا دیا۔ اور اس کی تقلید میں اندر کی جانب چل پڑا۔

"دراصل میں کل میری SUB STAGE ہے۔ اس لیے میں ذرا اسٹریس میں تھی۔"

اس کے ساتھ اندر کی طرف جاتے ہوئے وہ نہ جانے کیوں وضاحت کر رہی تھی۔ خضر کو اس کا یہ انداز بہت اچھا لگا۔

"اٹس او کے۔ ایسا ہو جاتا ہے۔" وہ ہلکے سے مسکرا کر نرمی سے بولا تھا۔

ماہ نور سے ہونے والی وہ مختصر سی ملاقاتوں نے خضر پر گہرا اثر ڈالا تھا اور وہ پیاری سی لڑکی سیدھی اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ خضر نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ کسی لڑکی میں یوں دلچسپی لے گا۔ اس کے گھر کا ماحول ایسا نہیں تھا کہ وہ اپنی پسند سے شادی کرنے کا سوچ سکتا۔ مگر اب ماہ نور نہ جانے کیسے اسے اتنی اچھی لگنے لگی تھی کہ دن میں بے شمار مرتبہ اسے ماہ نور کا خیال آتا اور وہ مسلسل اس کے بارے میں سوچے جاتا۔ وہ تصور ہی تصور میں سینکڑوں مرتبہ اسے اپنے آس پاس دیکھتا اور گھنٹوں مسرور رہتا۔ مگر اس کی یہ دیوانگی بہت دنوں تک برقرار نہیں رہ سکی تھی۔ کیونکہ عمر میں کم ہونے کے باوجود وہ بہت سمجھدار اور ذمہ دار طبیعت کا مالک تھا پھر اسے بچپن سے ایسے حالات ملے تھے۔ جنہوں نے اسے اپنی عمر سے کہیں زیادہ تجربہ دے ڈالا تھا۔ اس لیے بہت جلد تمام حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ماہ نور سے وہ جتنی بھی محبت کیوں نہ کر لے اسے حاصل کرنا اس کے لیے ہرگز آسان نہیں ہے۔

ایک تو خود اسے گھر اور خاندان میں کوئی اس چیز کو قبول نہ کرتا کہ وہ اپنی پسند سے شادی کر لے۔ پھر ماہ نور اور اس کے حالات میں نمایاں فرق تھا اس کے گھر کے معاشی حالات ایسے تھے کہ بس عزت سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ جبکہ ماہ نور کے والد اور دونوں بڑے بھائی اچھی ملازمتوں پر تھے پھر ماہ نور خود ڈاکٹر بن رہی تھی اکلوتی ہونے کی وجہ سے وہ گھر بھر کی لاڈلی بھی بہت تھی ایسے میں خضر کے لیے یہ تصور کرنا مشکل تھا کہ ماہ نور ان کے گھر آکر ان کے ماحول کا حصہ بن جائے۔

ان ساری باتوں کو سوچتے ہوئے خضر نے ماہ نور کے

لیے اپنے دل میں موجود محبت کو اپنے تک ہی محدود رکھنے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ آنے والے دنوں میں اس کی ماہ نور سے اچھی خاصی بے تکلفی بھی ہو گئی۔ اس نے اور معاذ نے ان کے گھر کے قریب کی ایک اکیڈمی میں میتھس اور فزکس کی ٹیوشن پڑھنا شروع کی تھی اور خضر کا گھر چونکہ وہاں سے بہت دور پڑتا تھا اور اس کے لیے کالج کے بعد گھر جانا اور پھر اکیڈمی پہنچنا مشکل ہو جایا کرتا تھا اس لیے معاذ کے اصرار پر اب اس نے کالج سے ان کے گھر آنا شروع کر دیا تھا۔ جہاں وہ لوگ دوپہر کا کھانا کھا کر کچھ وقت آرام یا گپ شپ میں گزارتے پھر چار بجے اکیڈمی چلے جاتے۔ ان کے گھر کا ماحول چونکہ کافی دوستانہ سا تھا اس لیے کچھ ہی دنوں میں خضر کی نا صرف معاذ سے بڑے عامر سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی بلکہ ماہ نور سے بھی بلا تکلف بات چیت کرنے لگا۔ اکثر جب وہ تینوں لڑکے محفل سجائے بیٹھے ہوتے اور ماہ نور فارغ ہوتی تو ان کے پاس آ بیٹھتی۔

وہ بہت ذہین اور حاضر جواب ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سلیقہ شعار اور سگھڑ بھی تھی۔ اکثر وہ لوگ اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی طرح طرح کی ڈشز سے بھی لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ ایسے میں خضر کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی تھی۔ جوں جوں اس پر ماہ نور کی خوبیاں آشکار ہوتی تھیں۔ اس کے دل میں ملال کا احساس گہرا اور دبیز ہوا جاتا تھا۔ اگر وہ اتنا متحمل مزاج اور نرم خو نہ ہوتا تو شاید کسی روز پھٹ ہی پڑتا مگر اس نے کمال مہارت سے اپنے دل کی سب سے بڑی خواہش کو اپنے اندر ہی چھپا لیا تھا۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ جب بھی اس کی یہ خواہش اس کے من کو بے کل کرنے لگتی وہ بے اختیار ہی اللہ کے سامنے جھولی پھیلا کر ماہ نور کو مانگنے لگتا۔

اور شاید کسی قبولیت کی گھڑی میں اس نے اپنے رب کے سامنے دست سوال دراز کیا تھا کہ ماہ نور کے دل میں خود بخود ہی اس کی محبت کا بیج پھوٹ پڑا۔

✲ ✲ ✲

طنز و مزاح سے بھرپور کالم

باتیں انشاء جی کی

ابن انشاء

قیمت: -/300 روپے
ڈاک خرچ: -/30 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لیے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

www.pkdigest.com

وہ چھٹی کا دن تھا۔ معاذ، خضر، عامر اور کچھ اور لڑکے لان میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ماہ نور کی کچھ سہیلیاں آئی ہوئی تھیں وہ لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں جب اس کی قریبی دوست سیما نے کھڑکی سے نظر آتے خضر کو دیکھا اور فوراً ہی ماہ نور سے اس کے متعلق پوچھنے لگی۔

"ماہ نور یہ بلیک شرٹ والا لڑکا کون ہے۔ اسے پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔"

اس کے انداز میں اشتیاق تھا ماہ نور نے اس کی نظروں کے تعاقب میں کھڑکی سے دکھائی دیتے خضر کی طرف دیکھا جو کچھ دیر پہلے ہی وہاں آکر کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور گھنے سیاہ بالوں نے اس کی کشادہ پیشانی کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس لمحے وہ ماہ نور کو نہ جانے کیوں اتنا اچھا لگا کہ وہ اسے دیکھے گئی۔

"تم نے بتایا نہیں یہ لڑکا کون ہے؟" اس کی خاموشی پر سیما نے دوبارہ بے صبری سے پوچھا تھا ماہ نور نے ناگواری نظر سیما کے چمکتے دمکتے حسین چہرے پر ڈالی اور بجھے بجھے انداز سے بولی۔

"یہ خضر ہے معاذ کا دوست اور کلاس فیلو۔" اسے نہ جانے کیوں اپنی آواز اجنبی سی لگی تھی اچانک ہی ارد گرد کے سارے منظر دھندلے سے پڑ گئے تھے اور وہ جو ابھی چند منٹ پہلے خوشدلی سے قہقہے لگا رہی تھی۔ اب ہر چیز سے بے زار سی ہونے لگی تھی۔ سیما کا خضر کی طرف بار بار دیکھنا اسے بہت برا لگ رہا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اٹھ کر کھڑکی بند کر دے۔

"بہت زبردست ہے یار اس سے میرا تعارف ہی کروا دو۔ کیا پرسنالٹی ہے۔" سیما اب خضر کی تعریف کر رہی تھی ماہ نور کو اس پر شدید غصہ آنے لگا۔

"فضول باتیں نہ کیا کرو۔" اس نے بے زاری سے سیما کو ڈانٹ دیا۔

پھر جتنی دیر خضر نظر آتا رہا سیما بار بار اس کا تذکرہ کرتی رہی اور ماہ نور اندر ہی اندر کھولتی رہی۔ اسے کیوں سیما کا خضر کی طرف جھکاؤ برا لگ رہا ہے وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ بس وہ اتنا چاہتی تھی کہ کسی طرح خضر کو سیما کی نظروں سے دور کر دے۔

ان لوگوں نے جانے کا فیصلہ کیا تو پہلی بار ماہ نور کو ان کے جانے کے احساس سے خوشی ہوئی اس نے رسماً بھی ان لوگوں کو نہیں روکا۔ مگر ان کے جانے کے بعد جب وہ برتن کچن میں رکھ کر ڈرائنگ روم کی کھڑکی بند کرنے کے لیے آئی تو گیٹ کے قریب خضر اور معاذ کے قریب کھڑی سیما کو دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا۔ اس نے تلملاتے ہوئے زوردار آواز سے کھڑکی بند کی اور اپنے کمرے میں جا کر بے مقصد یہاں سے وہاں ٹہلنے لگی۔

☼ ☼ ☼

اس رات وہ دیر تک جاگتی رہی۔ جب بھی آنکھیں بند کرتی خضر کا چمکتی سیاہ آنکھوں سے سجا چہرہ اس کے سامنے آ جاتا وہ اتنے دنوں سے اس کو دیکھ رہی تھی مگر آج سے پہلے اس کو کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ خضر کی آنکھوں میں بڑی میٹھی سی چمک ہے اور یہ کہ اس کی خوب صورت آنکھوں پر سایہ فگن پلکیں بہت لمبی اور گھنی ہیں۔

آج سے پہلے تو اس کو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ خضر کے چہرے کے خوب صورت نقوش میں ایک عجیب سی نرمی جھلکتی ہے۔ جو اس کی فطرت اور اس کے مزاج کی نرمی کا عکس ہے۔ آج پہلی بار اسے رہ رہ کر خضر کی ٹھہری ہوئی خوب صورت آواز اور اس کا نرم لہجہ یاد آ رہے تھے۔

اسے خضر اچھا لگتا تھا۔ اپنی عمر کے دیگر لڑکوں کے برعکس وہ بڑا ذمہ دار اور میچور لڑکا تھا۔ اس کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنا اس کے لیے چائے یا کافی بنانا اس سے کسی چھوٹے موٹے کام کی فرمائش کرنا اسے ہمیشہ سے پسند تھا۔ مگر اسے خضر سے محبت ہو جائے گی ایسا اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ یا پھر یہ محبت پہلے سے اس کے دل میں موجود تھی اس پر منکشف آج ہی ہوئی تھی۔

وہ بہت عجیب اور متضاد سی کیفیات کا شکار ہو رہی تھی پوری رات بے چینی میں گزارنے کے بعد اگلا پورا دن وہ کالج میں بھی پریشان سی رہی۔ خضر کے مزاج کی گہرائی اور تحمل مزاجی کے برعکس ماہ نور بہت جلد باز اور شدت پسند تھی۔ اس لیے محبت کے جس خزانے کو خضر کسی متاع حیات کی طرح اتنے مہینوں سے سب سے چھپائے پھر رہا تھا۔

ماہ نور اسے ایک دن کے لیے بھی تنہا سنبھالنے کی ہمت خود میں نہیں پا رہی تھی اور بے کلی سے جلے پیر کی بلی کی طرح یہاں سے وہاں پھر رہی تھی۔

سہ پہر کو وہ ممی کے کہنے پر معاذ کے کمرے میں چائے کی ٹرے لے کر گئی تو وہاں خضر اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ ماہ نور پچھلے چوبیس گھنٹوں سے مسلسل اسے ہی سوچ رہی تھی اور اب اسے ایکدم اپنے سامنے دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا اور چہرہ گلابی پڑ گیا۔

"معاذ کہاں ہے؟" خضر کو اپنی جانب دیکھتا پا کر اس نے بڑے لٹھ مار انداز سے سوال کیا تھا۔

"کوئی سی ڈی واپس کرنا تھی ویڈیو سینٹر تک گیا ہے۔" اس کے لٹھ مار انداز کے باوجود وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں بولا تھا۔ جسے ماہ نور نے شدت سے محسوس کیا اسے رونا آنے لگا۔

"تم آج جلدی گھر آ گئی ہو؟" اس کے ہاتھ سے ٹرے پکڑتے ہوئے خضر نے یونہی برسبیل تذکرہ پوچھ لیا۔ ماہ نور چڑ گئی۔ پتا نہیں کیوں اسے خضر کے منہ سے نکلے ہوئے ہر فقرے پر غصہ آ رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ خضر جان بوجھ کر ان لفظوں کو اپنے لبوں کی قید سے آزاد نہیں کر رہا جن کو سننے کے لیے اس کی سماعتیں منتظر ہیں۔

"ظاہر ہے جلدی آ گئی ہوں تو ہی گھر پر نظر آ رہی ہوں۔" وہ غصے سے بولی تھی۔

"کیا ہوا؟" خضر نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ "انگارے کیوں چبا رہی ہو۔ کسی نے کچھ کہا ہے؟"

"کچھ بھی ہوا ہو، کسی کو میری کیا پروا؟" اب کی بار وہ آزردگی سے بولی تھی۔

"اچھا۔" خضر نے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا۔ "تمہیں کیسے پتا کہ کسی کو تمہاری پروا ہے یا نہیں۔" اپنے مزاج کے برعکس وہ شوخی سے بولا تھا۔ ماہ نور نے جھکی پلکیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا وہ بالکل سامنے کھڑا تھا اور بہت توجہ اور دھیان سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے خوب صورت چہرے پر اس لمحے ایسا کچھ ضرور تھا جس نے ماہ نور کو گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا۔ اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا اور سدا کی حاضر جواب اور منہ پھٹ ماہ نور اس بے حد کم گو اور ریزرو رہنے والے شخص کو کوئی جواب دیے بغیر تقریباً بھاگتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

ماہ نور کے رویے نے خضر کو اچھا خاصا الجھا دیا تھا۔ شام سے رات تک وہ اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ مگر ایسی کوئی بات اسے یاد نہیں آئی جو حالیہ دنوں میں ہوئی ہو اور ماہ نور کے رویے میں تبدیلی کا باعث بنی ہو۔

رات کو وہ پڑھنے بیٹھا تب بھی یہی خیال اس کے ذہن میں تھا جسے بڑی مشکل سے جھٹلا کر وہ پڑھائی میں دل لگانے میں کامیاب ہو سکا مگر ابھی اسے پڑھتے ہوئے آدھا گھنٹہ ہی گزرا تھا جب اس کے موبائل پر کسی اجنبی نمبر سے کال آئی لیکن اس کے بار بار بولنے پر بھی دوسری جانب سے کوئی نہیں بولا۔ آخر اس نے کال کاٹ دی اور دوبارہ کتاب کھول لی۔ لیکن پانچ منٹ بعد ہی اس نمبر سے دوبارہ کال آنے لگی۔ دوسری بار بھی اس کی ہیلو ہیلو کے جواب میں جب ادھر سے کوئی نہیں بولا تو اسے غصہ آنے لگا۔ لیکن اپنے مزاج کے مطابق اس نے غصے کا فوری اظہار نہیں کیا بلکہ نرمی سے بولا۔

"دیکھیے آپ جو کوئی بھی ہیں۔ یا تو آپ بات کریں یا پھر دوبارہ فون مت کیجیے گا۔"

شائستگی اور نرمی کے باوجود اس کے لہجے میں وارننگ تھی۔ ایک پل کے لیے دوسری جانب خاموشی رہی پھر ماہ نور کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

www.pkdigest.com

"خضر میں..... میں ماہ نور بات کر رہی ہوں۔"

"ماہ نور۔" وہ حیران رہ گیا۔ "کیا بات ہے خیریت تو ہے نا۔"

اس نے پریشانی سے سوال کیا۔

"جی سب ٹھیک ہے مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا۔" وہ بمشکل ہمت وقت سے بولی تھی۔

"ہاں ہاں کہو کیا بات ہے؟"

"خضر میں.....۔" وہ ایک بار پھر چپ کر گئی۔

"بولو ماہ نور کیا بات ہے۔" خضر نے کسی ننھی بچی کی طرح اسے چمکارا۔

"میں آپ.....۔" وہ ابھی پھر جھنجلانے لگی۔ "آخر آپ کو پتا کیوں نہیں چل رہا۔"

"کچھ کہو گی تو ہی مجھے پتا چلے گا نا۔" وہ بغیر اکتائے نرمی سے کہہ رہا تھا۔ ماہ نور کو نہ جانے کیوں ان دنوں اس نرمی پر رونا آنے لگتا تھا۔

"خضر میں.....۔" اس کا گلا رندھ گیا۔ "مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔"

سارا دن پٹر پٹر بولنے والی ماہ نور نے جس مشکل سے یہ چند لفظ بولے یہ وہی جانتی تھی۔ اتنا بولنے کے بعد اس کا حوصلہ شاید جواب دے گیا تھا اس نے خضر کا جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔ خضر حیرت سے ساکت و صامت بیٹھا رہ گیا اس کے کانوں میں ماہ نور کے الفاظ برابر گونج رہے تھے اور اس کی سماعتیں بے یقینی کا شکار ہو رہی تھیں۔

"کیا واقعی یہ اس نے کہا ہے؟"

"کہیں اس نے مذاق نہ کیا ہو۔"

"میں نے سمجھنے میں غلطی تو نہیں کی؟"

نہ جانے کتنی ہی دیر تک وہ سوالوں میں الجھا رہا پھر جیسے کسی وجدان کی طرح دل پر یقین اترا تھا کہ جو کچھ اس نے سنا وہ سب سچ تھا بے اختیار ہی اس نے ماہ نور کا نمبر ڈائل کر دیا۔ دوسری جانب سے پہلی ہی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔ ماہ نور ابھی بھی رو رہی تھی۔ اس کے رونے سے خضر کو تکلیف ہوئی تھی۔

"نور.....۔" بے ساختہ ہی اس نے ماہ نور کو اس نام سے پکارا۔ آج سے پہلے اس نے اسے کبھی اس نام سے مخاطب نہیں کیا تھا یا پہلی بار ہی مخاطب کرتا آیا تھا۔

ماہ نور کو یاد نہیں تھا کہ اس کا نام آج سے پہلے کسی نے اتنے پیار سے لیا ہو اس کے رونے میں شدت آ گئی۔

"نور..... کیوں رو رہی ہو۔ مت رو پلیز۔" وہ بہت اپنائیت اور محبت سے کہہ رہا تھا۔

"تم تو بس ہنستی کھلکھلاتی ہوئی ہی اچھی لگتی ہو۔ آنسو تمہارے لیے نہیں ہے نور..... پلیز چپ کر جاؤ۔"

"آپ..... آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں نا؟" وہ آنسوؤں کے بیچ کسی چھوٹی سی معصوم بچی کی طرح پوچھ رہی تھی خضر کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

"پگلی..... میں تم سے بھلا کیوں ناراض ہوں گا۔ میں تو تمہیں نہ جانے کب سے اپنی دعاؤں میں مانگ رہا ہوں۔"

"پھر بھی مجھ سے کہا کیوں نہیں؟" وہ اب رونا بند کر چکی تھی اور روٹھے روٹھے انداز سے پوچھ رہی تھی۔

"انتظار کر رہا تھا کہ کب میری نور کے دل میں میرے لیے محبت کی کونپل پھوٹے۔ کب وہ خود میری جانب متوجہ ہو اور مجھے اپنے دل میں جگہ دے دے۔ میں تم پر اپنی محبت کو مسلط نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

اس کے لہجے میں کچھ عجیب سا احساس تھا۔ ماہ نور کا دل گداز ہونے لگا مگر اب وہ دوبارہ سے رونا نہیں چاہتی تھی اس لیے دانستہ بات بدل گئی۔

"آپ کل آئیں گے نا؟" اس نے پوچھا تھا۔

"تم حکم کرو تو میں ابھی حاضر ہو جاتا ہوں۔" وہ ہنس کر شوخی سے بولا تھا۔

"اللہ حافظ۔" ماہ نور نے گھبرا کر کہا اور فون بند کر دیا اس کے اس انداز پر خضر دھیرے سے ہنس دیا خوشی اور اطمینان سے لبریز ہنسی اسے لگا کہ ہنسی کا یہ روپ اس نے پہلی بار محسوس کیا ہے۔ جیسے دل پر رم جھم پھوار کی طرح برستی خوشی کا احساس اس کے لیے بے حد نیا

اور انوکھا سا تھا۔

☼ ☼ ☼

ماہ نور نے خضر کو اگلے روز گھر آنے کا تو کہہ دیا تھا مگر اگلے دن جب وہ ان کے گھر آیا تو ماہ نور کو اس کا سامنا کرنا اتنا مشکل لگا کہ جب تک خضر ان کے گھر موجود رہا وہ تمام وقت اپنے کمرے سے ہی باہر نہیں نکلی اور یہی نہیں اگلے چار روز تک اس نے یہی وطیرہ اپنائے رکھا۔ جب سے اس نے خضر کے سامنے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ اسے خضر کا سامنا کرنے کا تصور ہی سوہان روح لگ رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ خضر سے پہلے جیسے اعتماد کے ساتھ کیسے بات کرے گی۔

دوسری جانب خضر اس کی مسلسل غیر حاضری سے بے چین سا تھا۔ وہ ہر روز دل میں اسے دیکھنے اس سے ملنے کی تمنا لے کر آتا مگر جب وہ سامنے ہی نہ آتی تو ہر روز مایوس لوٹ جاتا چار روز اس صورت حال میں گزرے تو وہ رہ نہیں سکا اور اس نے ماہ نور کے موبائل پر فون کر ڈالا۔

"نور! کہاں غائب ہو یار آنکھیں ترس گئی ہیں تمہیں دیکھنے کے لیے۔" ماہ نور کی آواز سنتے ہی وہ اپنے مزاج کے بالکل خلاف بے صبری سے بولا تھا۔

"جی گھر پر ہی ہوں۔" وہ مری مری آواز میں بول رہی تھی۔ خضر چند لمحوں کے لیے خاموش سا ہو گیا۔ پھر مدھم آواز میں بولا۔

"میرے سامنے کیوں نہیں آتی ہو؟"

"جی وہ بس ایسے ہی۔" وہ جھجک کر چپ ہو گئی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کہہ کر اپنی صفائی پیش کرے۔

"دراصل مجھے بہت عجیب سا لگ رہا ہے۔ بلکہ شاید کچھ گلٹی سا فیل ہو رہا ہے۔" آخر اس نے ہمت کر کے کہہ دیا۔ اس کی بات سن کر دوسری جانب ایک بار پھر خاموشی چھا گئی اور خاموشی کا یہ وقفہ خاصا طویل تھا۔

"تم یہ سوچ رہی ہو کہ مجھ سے پہلے محبت کا اظہار کر کے تم نے کوئی غلطی کی ہے۔" بڑی دیر کے بعد وہ بولا تھا۔

"نہیں غلطی کا احساس تو نہیں ہو رہا شاید میں نے جلد بازی سے کام لیا ہے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے نور! تم جانتی ہو میں تب سے تم سے محبت کرتا آ رہا ہوں جب سے میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا ہے۔ تم نے تو شاید تب مجھ پر دھیان بھی نہیں دیا ہو گا مگر تمہارا پیارا سا معصوم چہرہ تب ہی میرے دل میں بس گیا تھا۔ جب میری پہلی نظر تم پر پڑی تھی۔ جانتی ہو نور! تم میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہو اور جب سے میرے دل کو یہ یقین ملا ہے کہ محبت کے اس سفر میں میں تنہا نہیں ہوں تو یقین کرو۔ خوشی سے میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے مجھے اپنی خوش نصیبی پر رشک آتا ہے۔ کہ میری نور بھی مجھ سے پیار کرتی ہے۔"

وہ بہت کم بولا کرتا تھا۔ مگر آج یوں بے تکان بول رہا تھا تو اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ نور کے دل میں چراغاں سا کرتا جا رہا تھا۔

"خضر آپ..... آپ بہت اچھے ہیں۔" وہ خاموش ہوا تو ماہ نور نے بے ساختہ کہا۔

"اور اچھا ہو جاؤں گا اگر تمہارا چاند سا مکھڑا میرے سامنے ہو گا۔" وہ شوخ ہو رہا تھا ماہ نور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ٹھیک ہے اس بارے میں بھی سوچیں گے۔" اس نے ہنستے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

خضر کی زندگی میں ماہ نور کا آنا خضر کے لیے بہت ساری تبدیلیوں اور خوشیوں کا باعث بن گیا تھا۔ ماہ نور سے پہلے تک اس نے جو زندگی گزاری وہ بے حد سیدھی سادی بلکہ بڑی حد تک ڈل سی تھی۔ وہ ذہین تھا مگر پڑھائی میں زیادہ دلچسپی نہ لینے کی وجہ سے اس نے کبھی پوزیشن نہیں لی تھی۔ گھر میں جو کام اسے کرنے کے لیے کہا جاتا وہ ہمیشہ بڑی خاموشی سے کر دیا کرتا تھا۔

اس نے بھی خود سے کوئی ایسا کام کرنے کا نہیں سوچا تھا جس سے اس کی یا اس کی فیملی کی زندگی میں کوئی بہتری آسکتی ہو۔ اس کے کوئی خاص شوق یا مشاغل بھی نہیں تھے۔ اس کے دوست بھی چند ہی تھے اور جو تھے ان سے بھی اس کی بہت زیادہ دوستی نہیں تھی۔

اس کے برعکس ماہ نور بے حد پراعتماد اور ہمہ وقت متحرک رہنے والی لڑکی تھی۔ وہ پڑھائی میں شروع ہی سے بہت اچھی تھی کیونکہ جو بھی پڑھتی تھی پوری توجہ اور محنت سے پڑھتی تھی۔ ساتھ میں اسے گھر کے کاموں سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ خاص طور پر گھر کی سجاوٹ اور کوکنگ ان دونوں چیزوں کا تو اسے گویا کریز ہی تھا۔ وہ بے حد باتونی اور دوستانہ مزاج کی مالک تھی۔ اس لیے جس محفل میں بھی جاتی لمحوں میں وہاں چھا جایا کرتی تھی۔ اس کے دوست بے شمار تھے۔ اپنے گھر میں بھی وہ سبھی سے بے تکلف تھی۔ اور ہر طرح کی بات بڑے اعتماد سے کرلیا کرتی تھی۔

خضر کی متحمل اور نرم طبیعت کے برعکس وہ جلد باز بھی تھی اور غصہ ور بھی لیکن اس کی یہ خامیاں ان کے باہمی تعلق کو اگر کبھی خراب کرنے بھی لگتی تھیں تو خضر کی نرمی کی وجہ سے ایسا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ وہ سبھی کے ساتھ بہت نرم رویہ رکھتا تھا مگر ماہ نور تو جیسے اس کے لیے کانچ کی کسی گڑیا سے بھی زیادہ نازک تھی۔ وہ اس کا بے حد خیال رکھتا تھا اور اسے خوش رکھنے کے لیے اس کی بیشتر باتیں بھی مان لیا کرتا تھا۔

یہ ماہ نور ہی کا اثر تھا کہ وہ جو پہلے گنے چنے لفظ بولا کرتا تھا اور ہر طرح کی گفتگو بس خاموشی سے سننے کا عادی تھا۔ اب وہ اپنا نقطہ نظر بیان کرنے لگا تھا۔ اس کی شخصیت میں یکدم ہی بہت اعتماد آگیا تھا۔ اور ماہ نور کی وجہ سے ہی وہ اپنی پڑھائی پر بھی بہت توجہ دینے لگا تھا۔ کیونکہ اسے اس بات کا ہر وقت احساس رہنے لگا تھا کہ ماہ نور کو ایک اچھی زندگی دینے کے لیے اسے اپنا کیریئر زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔

یہ اس کی شخصیت میں در آنے والے اعتماد کی بدولت ہی ہوا تھا کہ وہ اپنے لیے خود فیصلے کرنے لگا تھا ورنہ اس سے پہلے اس نے ہمیشہ وہی کیا تھا جو اباجی نے کہہ دیا اور اباجی کے کچھ بھی کہنے کا انداز ہمیشہ اتنا سرسری ہوتا تھا کہ خضر کو کبھی بھی کچھ کرتے ہوئے اس مسرت کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ ان کی کسی خواہش کو پورا کر رہا ہے۔

بی ایس سی کا رزلٹ آنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آگے کمپیوٹر سائنس میں ایم ایس سی کرے جبکہ اباجی چاہتے تھے کہ وہ میتھس میں ایم ایس سی کرے کیونکہ بی ایس سی اس نے ڈبل میتھ کے ساتھ کیا تھا۔

”اباجی! میتھس میں ٹیچر شپ کے علاوہ کوئی خاص اسکوپ نہیں ہے۔“ اس نے زندگی میں پہلی بار ان کے آگے سر جھکانے کی بجائے اختلاف کیا تھا۔

”کیوں نہیں ہے تم اپنی اکیڈمی کھول سکتے ہو۔ میتھس کے ٹیچر تو ہر ماہ لاکھوں روپے کماتے ہیں۔“ انہوں نے اس کا اعتراض مسترد کر دیا تھا۔

”اس طرح کی اکیڈمی کھولنے کے لیے بھی اچھے خاصے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے جسے فراہم کرنے میں مجھے برسوں لگ جائیں گے اور پھر مجھے پڑھانے میں زیادہ دلچسپی بھی نہیں ہے۔ آپ مجھے کمپیوٹر سائنس میں ہی ایڈمیشن لینے دیں مجھے یقین ہے کہ یہ میرے لیے ایک اچھا کیریئر ثابت ہوگا۔“

براہ راست اباجی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ اتنے اعتماد سے بولا تھا کہ انہیں مزید کچھ کہنا بے کار محسوس ہونے لگا۔

”ٹھیک ہے۔ اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو فارم فل کرکے جمع کروا دو۔“

وہ اپنے مخصوص سرد انداز سے کہہ کر دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہوگئے جسے وہ خضر کے آنے سے پہلے پڑھ رہے تھے۔ خضر کو ان کا یہ انداز ہمیشہ ہی تکلیف دیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس کا دل بوجھل سا ہو گیا ایک لمحے کے لیے تو اس کے جی میں آئی کہ وہ اباجی سے کہے کہ وہ ان کی خاطر میتھس میں ایڈمیشن لینے کے لیے

تیار ہے۔ مگر پھر اس نے اپنی اس خواہش پر یہ سوچ کر قابو پالیا کہ اباجی نے خوش تو تب بھی نہیں ہونا پھر خوامخواہ اپنا فیصلہ تبدیل کرنے کا کیا فائدہ۔ چند منٹ تک وہ وہیں بیٹھا رہا کہ شاید اباجی مزید کچھ کہیں مگر وہ تو جیسے اس کی موجودگی کو فراموش ہی کر چکے تھے۔ آخر وہ وہاں سے اٹھ کر آگیا۔

”یار میری سمجھ میں نہیں آتا اباجی کس قسم کے باپ ہیں۔ انہیں ہم میں رتی بھر بھی دلچسپی نہیں ہے۔“

رات کو فون پر ماہ نور کو ساری بات بتاتے ہوئے وہ دلگیر سا ہو گیا۔

”ایسی بات نہیں ہے خضر! دلچسپی نہ ہوتی تو وہ آپ کو آگے ایڈمیشن ہی نہ دلاتے۔ بس ہر انسان کا مزاج دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ لیکن ہر کسی میں کوئی نہ کوئی خاصیت ضرور ہوتی ہے ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ کے اباجی کو اپنے بچوں سے پیار نہ ہو بس ان کے پیار کے اظہار کا طریقہ مختلف ہوگا۔“

وہ اسے نرمی سے سمجھا رہی تھی خضر کو اپنے دل پر پڑا بوجھ کم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ ایسی ہی تھی خود چاہے کتنا ہی لڑتی جھگڑتی کتنا ہی غصہ دکھاتی مگر جب بھی خضر کو کوئی پریشانی ہوتی وہ اسے اتنی اچھی طرح سمجھایا کرتی تھی کہ مسئلہ کا حل نہ نکلنے کے باوجود خضر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتا تھا۔

☼ ☼ ☼

ایم ایس سی کے پہلے سمسٹر کا رزلٹ آیا تو خضر کی پہلی پوزیشن تھی۔ اپنی زندگی میں پہلی بار اس نے پوزیشن لی تھی اسے بہت عجیب سی فیلنگ ہو رہی تھی۔ خوشی کے مارے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے ماہ نور کو فون کرکے اپنی پوزیشن کا بتایا تو اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ ماہ نور حسب توقع اس کی کامیابی پر بہت خوش ہوئی تھی۔

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہے نور! میری زندگی میں تمہارے آنے سے نور ہی نور بھر گیا ہے ورنہ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں پڑھائی میں پوزیشن لوں گا یا اسٹیج پر پرفارم کروں گا۔“ وہ ممنونیت سے کہہ رہا تھا ماہ نور ہنس پڑی۔

”یہ سب آپ کی اپنی صلاحیتیں ہیں۔ جو باہر آ رہی ہیں ان میں میرا کوئی کمال ہے تو صرف اتنا کہ میں نے آپ سے ان صلاحیتوں کو باہر نکالنے پر آپ سے اصرار کیا ورنہ محنت اور صلاحیت تو سب آپ کی اپنی ہی ہیں۔“

وہ نرمی سے بولی تھی۔ اور یہ بات واقعی سچ تھی۔ ماہ نور کو پتا نہیں کیسے پتا چل جاتا تھا کہ خضر فلاں کام ضرور ہی کر سکتا ہے۔ اور وہ اس سے اتنا اصرار کرتی تھی کہ خضر کو اس کی بات مانتے ہوئے میدان عمل میں کودنا ہی پڑتا تھا۔ اور پھر کچھ تو اس کا یہ جذبہ کہ ماہ نور کا اعتماد مجروح نہ ہو اسے دکھ نہ پہنچے اور کچھ اس میں واقعی وہ کام کرنے کی صلاحیت بھی ہوتی تھی۔ اس لیے وہ ہمیشہ ہی بہت اچھا کر گزرتا تھا جیسے چند ہفتے پہلے ہونے والے ڈرامے میں اسے شہزادہ سلیم کا کردار کرنے کو کہا گیا تو پہلے اس نے صاف انکار کر دیا اس نے کبھی اسٹیج پر پرفارم نہیں کیا تھا۔ مگر یونیورسٹی کی ڈرامیٹک سوسائٹی کے پریذیڈنٹ کو وہ کچھ زیادہ ہی بھا گیا تھا اس لیے ان کی طرف سے اس کے انکار کے باوجود جب اصرار کیا جاتا رہا تو ایک روز اس نے باتوں باتوں میں ماہ نور سے ذکر کر دیا۔ مگر وہ تو اس کے پیچھے ہی پڑ گئی اس کا اصرار تھا کہ خضر کو یہ چانس ہرگز بھی مس نہیں کرنا چاہیے۔

”آپ یہ کر سکتے ہیں مجھے پورا یقین ہے۔“ وہ اتنے اعتماد سے بولی تھی کہ خضر اسے جھٹلا نہیں پایا اور صرف اسی کے اصرار پر اس نے ڈرتے ڈرتے یہ کردار ادا کرنے کی ہامی بھر لی تھی۔ مگر ڈرامے میں اس نے اتنی عمدہ پرفارمنس دی تھی کہ لوگ عش عش کر اٹھے شکل و صورت اور چال ڈھال سے تو وہ ویسے ہی کسی ریاست کا راجکمار ہی لگتا تھا اوپر سے اس کی مکالموں کی ادائیگی اتنے غضب کی تھی کہ وہ اس ایک کردار کی وجہ سے پوری یونیورسٹی میں مقبول ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

www.pkdigest.com

ڈیپارٹمنٹ کے تمام اسٹوڈنٹس اور فیکلٹی ممبرز کے ساتھ ساتھ دوسرے کچھ ڈیپارٹمنٹس کے لوگ بھی مدعو تھے۔ پارٹی سے صرف دو روز پہلے اس کا وہ سینئر ایک ایکسیڈنٹ میں اپنے دائیں بازو کی ہڈی تڑوا بیٹھا جس کو پروگرام کی کمپیئرنگ کرنا تھی۔ دوسرا کوئی لڑکا دستیاب نہیں ہو رہا تھا اس لیے سب کی نظریں خضر پر جا ٹھہریں۔ وہ چونکہ کچھ ڈراموں میں کام کر چکا تھا اس لیے سب کو پورا یقین تھا کہ وہ کمپیئرنگ بھی کر سکتا ہے۔ خضر نے ان کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ ڈائیلاگ یاد کر کے اسٹیج پر جا کر بولنے اور کسی پروگرام کی میزبانی کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے مگر کوئی اس کی توجیہہ سننے کو تیار ہی نہیں تھا حتیٰ کہ ماہ نور کو بتایا تو اس نے بھی فوراً ہی کہا کہ اسے یہ کام کر لینا چاہیے۔

"آپ بہت اچھا بولتے ہیں۔ آپ کی آواز اور لہجہ دونوں بہت خوب صورت ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ آپ یہ کام بھی بہت کامیابی سے کر لیں گے۔" وہ ہمیشہ کی طرح پورے یقین سے کہہ رہی تھی۔

"مگر یار! میں وہاں جا کر بولوں گا کیا پرسوں تو پارٹی ہے۔"

وہ بے چارگی سے گویا ہوا تھا۔ ماہ نور کے سامنے ویسے بھی اس کی دال گلنا مشکل تھی وہ اس سے بحث میں نہیں جیت سکتا تھا اور ویسے بھی پتا نہیں کیوں اسے یہ لگتا تھا کہ اگر ماہ نور کسی کام کے لیے کہہ دے کہ یہ آپ بہت اچھا کر لیں گے تو وہ واقعی اچھا ہو جایا کرتا تھا۔

"وہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ شام کو گھر آ جائیں ہم مل کر آپ کی بولی جانے والی ساری لائنیں لکھ لیں گے اور کل کا دن آپ ریہرسل کر لیں گے تو پرسوں کا پروگرام ان شاء اللہ بہت زبردست ہو جائے گا۔"

وہ سکون سے بولی تھی۔ خضر نے ہمیشہ کی طرح اس کی بات مان کر اس پروگرام کی میزبانی کی تھی اور واقعی اتنی اچھی کی تھی کہ اگلا ڈیڑھ برس اپنے ڈیپارٹمنٹ کے ہر فنکشن کی میزبانی اس کے سپرد کی جاتی رہی۔

وہ کام ماہ نور کے کہنے پر کیے تھے جن کو اس سے پہلے کرنا تو ایک طرف اس نے کبھی کرنے کا سوچا بھی نہیں تھا اور ان دو سالوں میں اسے اتنی کامیابیاں ملی تھیں کہ بعض اوقات وہ خود حیران رہ جایا کرتا تھا۔

ایم ایس سی کے آخری سمسٹر کا رزلٹ آنے سے پہلے ہی اسے ایک اچھی فرم میں ڈیٹا اینالسٹ کی جاب مل گئی تو اسے یوں لگا کہ قدرت اس کی منزل تک اسے پہنچانے کے لیے خود ہی راستے ہموار کر رہی ہے۔ ان دنوں وہ بے تحاشا خوش رہنے لگا تھا حالانکہ آفس کی مصروفیت اور گھر کے چھوٹے موٹے کام نمٹاتے ہوئے اسے ماہ نور سے ملنے اور بات کرنے کا موقع اب کم ہی ملتا تھا مگر وہ پھر بھی بے حد خوش تھا اسے یقین تھا کہ اب ماہ نور بہت جلد اس کی زندگی میں خوشیوں کے تمام رنگ بھرنے کے لیے اس کے چھوٹے سے گھر میں آ جائے گی۔

☼ ☼ ☼

"ماہ نور! کراچی سے تمہاری خالہ کا فون آیا ہے۔ انہوں نے عادل کے لیے تمہارا ہاتھ مانگا ہے۔"

اس رات کھانے کی میز پر ماہ نور اور ممی کے علاوہ عمران، عامر اور معاذ بھی تھے جب ممی نے بڑے سرسری انداز سے اسے بتایا۔ البتہ ان کے چہرے پر رقم خوشی اور جوش صاف نظر آ رہے تھے۔

عادل اس سے تین سال بڑا تھا اور ایک سال پہلے ہی اس نے اپنا ایم بی بی ایس مکمل کیا تھا ان دنوں وہ ایف آر سی ایس کے لیے امریکہ جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ ماہ نور کی عادل سے شروع ہی سے بہت بنتی تھی۔ کیونکہ ان دونوں کی پسند ناپسند بہت ملتی جلتی تھی۔ عادل ایک خوش شکل اور خوش مزاج لڑکا تھا اور ماہ نور کے خالو کی وسیع جائیداد کا اکلوتا وارث بھی تھا۔ ان ساری خوبیوں کی وجہ سے ممی کو پورا یقین تھا کہ ماہ نور کو یہ پرپوزل بہت پسند آئے گا۔ وہ میڈیکل کے تیسرے سال کا امتحان دے چکی تھی اور ممی کی خواہش

پچھلے دو سالوں میں اس کے جتنے بھی رشتے آئے تھے وہ ان میں کوئی نہ کوئی نقص نکال کر انکار کرتی آئی تھی مگر اس بار ممی کو یقین تھا کہ وہ انکار نہیں کرے گی اسی لیے وہ بے حد خوش تھیں یوں بھی عادل دیکھا بھالا لڑکا تھا۔ اس سے ماہ نور کی شادی کر کے وہ بالکل بے فکر ہو سکتی تھیں۔

"ممی اللہ کے لیے کبھی میری شادی کے علاوہ بھی کوئی بات کر لیا کریں۔ ہر چوتھے دن آپ کے پاس میرے لیے ایک رشتہ موجود ہوتا ہے۔ میں اس صورت حال سے تنگ آ گئی ہوں۔ نہیں کرنی مجھے کسی سے بھی شادی۔"

ان کی توقع کے برعکس وہ بہت چڑ کر بولی اور کھانے کی میز سے اٹھ کر چلی گئی۔ ممی ہکا بکا اس کی خالی ہو جانے والی کرسی کو دیکھتی رہ گئیں۔ وہ گھر بھر کی لاڈلی تھی مزاج کی بھی ذرا تیز تھی مگر بد تمیزی بہرحال کبھی نہیں کیا کرتی تھی اس لیے اس کا یہ انداز انہیں بے حد پریشان کر گیا۔

"کیا ہو گیا ہے اس لڑکی کو میں نے بھلا اسے کیا کہا تھا جو یوں غصے سے بل کھانے لگی۔" وہ حیرت اور پریشانی سے بڑبڑائی تھیں۔

"ممی! اگر وہ ابھی شادی کے موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تو آپ اس سے بار بار اصرار کیوں کرتی ہیں تھوڑا عرصہ رک جائیں۔" عامر نے کھانا کھاتے ہوئے لاپروائی سے کہا تھا۔

"اور کیا اس کی پڑھائی بھی تو اتنی سخت ہے۔ اسے یہ سب اچھا نہیں لگتا ہو گا۔" معاذ کا انداز بھی سراسر عامر والا تھا۔ البتہ عمران بالکل خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا اس نے اس موضوع پر ایک لفظ نہیں بولا تھا۔ ممی بھی ان دونوں کی باتیں سن کر مزید کچھ کہے بغیر کھانا کھانے لگی تھیں۔

"آپ فکر نہ کریں ممی! میں ماہ نور سے بات کرتا ہوں۔" کھانے کی میز سے اٹھتے ہوئے عمران نے ممی کو دلاسا دیا تھا معاذ اور عامر پہلے ہی اٹھ کر جا چکے تھے ممی

اور برتن سمیٹنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے ماہ نور! کوئی پرابلم ہے تو مجھ سے کہو۔" عمران اس کے کمرے میں آیا تو وہ کتابوں کا ڈھیر بیڈ پر پھیلائے بے زار سی بیٹھی اپنی نوٹ بک پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی عمران اس کے پاس بیڈ پر ہی بیٹھ گیا اور نرمی سے پوچھنے لگا۔

"کوئی پرابلم نہیں ہے بھائی۔" وہ گردن جھکائے آہستگی سے بولی تھی۔ یہ اس کا انداز نہیں تھا وہ ہمیشہ مقابل کی آنکھوں میں دیکھ کر بات کیا کرتی تھی عمران ہلکے سے مسکرا دیا۔ ماہ نور اس سے چھ برس چھوٹی تھی اور اسے بہت پیاری تھی۔ اس نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر صورت میں ماہ نور کا ساتھ دے گا چاہے وہ کچھ بھی کہے۔

"پھر تم نے عادل کے پرپوزل والی بات پر اتنی بری طرح سے ری ایکٹ کیوں کیا۔ ممی کو بہت بری لگی ہے تمہاری یہ حرکت۔"

"سوری بھائی۔" ہمیشہ کی طرح اس نے فوراً ہی اپنی غلطی تسلیم کر لی تھی۔ "میں ممی سے بھی ایکسکیوز کر لوں گی مگر آپ ان سے کہہ دیں کہ وہ میری شادی کا ذکر ابھی نہ کیا کریں مجھے اچھا نہیں لگتا۔" وہ اس بار بھی عمران کی طرف دیکھے بغیر بولی تھی۔

"کیوں نہیں اچھا لگتا تمہیں شادی کا ذکر؟ ادھر میری طرف دیکھ کر بات کرو۔" عمران کے کہنے پر اس نے بس ایک بار پلکیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور پھر سے سر جھکا لیا۔

"تم کسی اور کو پسند کرتی ہو؟" وہ بڑے اطمینان سے پوچھ رہا تھا اس بار ماہ نور نے تیزی سے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ چند لمحے وہ اس کی طرف دیکھتی اور کچھ سوچتی رہی پھر پورے اعتماد سے بولی۔

www.pkdigest.com

جی۔

"گڈ۔" عمران ہلکے سے مسکرا دیا وہ جانتا تھا کہ ماہ نور حد سے زیادہ صاف دل ہے۔ وہ اپنے سے متعلق کسی بات میں شاید کہنے کی عادی نہیں تھی ہاں یا پھر نہیں اس کے پاس ہمیشہ ان دو میں سے ایک جواب ہوتا تھا۔

"تو پھر اس سے کہو وہ اپنے گھر والوں کو بھیجے۔ وہ بات کر لیں گے تو ممی بھی مطمئن ہو جائیں گی اور تم بھی بار بار ڈسٹرب نہیں ہو گی۔"

"وہ ابھی اپنے گھر والوں کو نہیں بھیج سکتا۔ ابھی اسے اپنا کیریئر بنانا ہے۔ پھر ہی وہ اپنے والدین سے اپنی شادی کی بات کر سکتا ہے۔" وہ اب اعتماد سے بات کر رہی تھی۔

"کون ہے وہ؟" عمران نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"خضر۔" وہ ذرا جھجک بولی تھی۔

"ہوں مجھے بھی چند لمحے پہلے اس کا خیال آیا تھا۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ میں اگرچہ اس سے بہت زیادہ بار تو نہیں ملا مگر جب بھی ملا ہوں وہ مجھے اچھا ہی لگا ہے۔ مگر ماہ نور تم جانتی ہو نا ان کے معاشی حالات بہت اچھے نہیں ہیں میرا مطلب ہے تم بچپن سے جس طرز زندگی کی عادی ہو خضر کے ساتھ رہتے ہوئے اس طرز زندگی تک پہنچنے کے لیے تمہیں کافی انتظار کرنا ہو گا اور شاید کچھ قربانیاں بھی دینا پڑیں۔ تم نے اس بارے میں سوچ لیا ہے۔"

"جی اور آپ جانتے ہیں میں فیصلہ کر کے پیچھے بھی نہیں ہٹتی۔"

"اچھی بات ہے۔ میں ممی سے بات کر لیتا ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"ممی مان تو جائیں گی نا۔" وہ اس کے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور اب کچھ پریشانی سے پوچھ رہی تھی۔

"تم فکر نہ کرو انہیں منانا میرا کام ہے۔ تم بس اپنے غصے پر تھوڑا قابو رکھنا سیکھو۔ خضر تو بے چارہ بڑا نرم مزاج کا ہے۔ وہ تمہاں [illegible]" عمران اسے سمجھانے کے ساتھ اب چھیڑ رہا تھا۔

"بھائی۔" وہ غصے سے چیخی تو وہ اس کے سر پر پیار سے چپت لگا کر ہنستا ہوا باہر نکل گیا ماہ نور چند لمحوں تک کھڑی مسکراتی رہی اسے گہری طمانیت کا احساس ہو رہا تھا جیسے سر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ چند لمحوں کے بعد اس نے موبائل اٹھایا اور خضر کو کال کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

خضر اب کافی حد تک اپنی جاب میں سیٹ ہو گیا تھا اور خود کمانا شروع کر دینے کے بعد اس کی ذات کے اعتماد میں بھی بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ پھر ماہ نور نے جب سے اسے عمران کے ساتھ ہونے والی اپنی گفتگو کے بارے میں بتایا تھا۔ تب سے اسے اپنا آپ بہت ہلکا پھلکا لگنے لگا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے جب بھی ماہ نور کے لیے آنے والے کسی رشتے کا اسے پتا چلتا وہ بری طرح سے پریشان ہو جایا کرتا تھا۔

اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ وہ پہلی تنخواہ سے ہی گھر میں دیا کرتا تھا اور جو کچھ اس کے پاس بچتا تھا اس میں سے وہ اکثر بہن بھائیوں اور امی جان کے لیے ان کی پسند کی کوئی نہ کوئی چیز لے آیا کرتا تھا۔ البتہ ابا جی کے لیے وہ بطور خاص کبھی کچھ نہیں لایا تھا۔ کیونکہ اسے لگتا تھا کہ اس کی لائی ہوئی کوئی چیز ابا جی کو پسند آجانا انتہائی مشکل تھا۔ اس لیے اس نے کبھی ایسی ہمت بھی نہیں کی تھی۔

برسر روزگار ہونے کے بعد اس کے لیے ابا جی کے رویے میں بھی کسی حد تک تبدیلی آگئی تھی۔ باقی بچوں کی نسبت وہ اب اس کی بات ذرا توجہ سے سننے لگے تھے۔ اور ابا جی کے علاوہ اپنی دادی اور پھپھیوں کے لیے بھی وہ کافی اہم ہو چکا تھا۔ لیکن خضر ان کے لیے اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ ابھی بھی محسوس نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ دادی اور پھپھیوں نے انہیں بھی ویسا پیار نہیں دیا تھا جیسا پیار ان کا حق تھا وہ ہمیشہ ان

سے الگ تھلگ سی رہتی تھیں۔ جب بھی وہ ان کے یہاں آئی ہوتیں تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ صرف ابا جی سے ملنے آئی ہیں۔ گھر کے کسی دوسرے فرد سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا حالانکہ امی جان ان لوگوں کا خیال رکھنے اور ان کی خدمت کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتی تھیں مگر پھر بھی وہ ان سے کبھی خوش نظر نہیں آتی تھیں۔ امی جان کے ساتھ ان کا یہ رویہ خضر کو ہمیشہ ہی برا لگتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ابا جی ان کو ایسا کرنے سے روکیں اور جب بھی وہ کسی چھوٹی سی بات کو ایشو بنا کر امی جان کی شکایتیں لگا رہی ہوں تو ابا جی انہیں ایسا کرنے سے سختی سے روک دیں۔ مگر اس کی دیگر کئی خواہشات کی طرح یہ خواہش بھی ہمیشہ دل میں ہی رہی تھی۔ البتہ اب اس نے اتنا ضرور کرنا شروع کر دیا تھا کہ دادی اور پھپھیوں کی طرف سے اگر امی جان کے ساتھ کوئی زیادتی ہوتی تو وہ خود حتی الامکان اس کی تلافی کرنے کی کوشش کرتا۔

☼ ☼ ☼

وہ چھٹی کا دن تھا خضر دیر سے سو کر اٹھا۔ وہ باہر صحن میں آیا تو اس نے دادی کو ایک چارپائی پر بیٹھے کچھ سوٹ پھیلائے ہوئے دیکھا وہ اگرچہ ان سے زیادہ گفتگو کرنے کا عادی نہیں تھا مگر بہت لاتعلق بھی نہیں رہتا تھا اس لیے ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

"دادی! یہ کس کے کپڑے ہیں؟" اس نے یونہی پوچھ کر قریب پڑا اخبار اٹھا لیا۔

"یہ نیلا سوٹ تمہاری بڑی چچی کا، سبز چھوٹی چچی کا، یہ کاسنی تمہاری پھپھو زینت کا اور یہ سرخ چھوٹی پھپھو کا۔" وہ بھی غالباً موڈ میں تھیں اس لیے باری باری سب کے سوٹوں کی تفصیل بیان کرنے لگیں۔

"اور ہاں جی! میں آپ کی بہو نہیں ہوں؟" امی جان خضر سے ناشتے کا پوچھنے آئی تھیں۔ اور دادی جان کی بات سن کر وہیں رک گئی تھیں۔

"نہیں بھئی ایسی بات نہیں ہے تم بھی ایک سوٹ لے لو۔" ان کے یوں کہنے پر دادی کو شاید شرمندگی کا احساس ہوا تھا۔ مگر انداز ان کا اب بھی سرسری سا ہی تھا۔

"نہیں رہنے دیں میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔ خضر تم ناشتے میں کیا لو گے۔" وہ اب خضر سے پوچھ رہی تھیں۔ خضر نے ان کے مرجھائے ہوئے اداس چہرے کو دکھ سے دیکھا۔ انہیں اس گھر میں آئے پچیس سال ہو گئے تھے مگر دادی نے آج تک دل سے انہیں نہیں اپنایا تھا۔ حالانکہ ان کی باقی دونوں بہوؤں اور بیٹوں سے زیادہ وہ ان کی فرمانبرداری کر رہی تھیں۔

"کچھ بھی بنا دیں امی جان! آپ کی بنائی ہوئی ہر چیز ہی لاجواب ہوتی ہے۔" ماں کی خاطر وہ بشاشت سے مسکرایا تھا اور اس کی مسکراہٹ نے واقعی جادو کا سا اثر کیا امی جان کے چہرے پر چھائے دکھ کے بادل ایک دم ہی چھٹ گئے۔ انہیں ایک عجیب سی تقویت اور سکون کا احساس ہونے لگا۔ وہ ہمیشہ ہی سے ان کا بہت خیال رکھتا آیا تھا انہیں یاد نہیں تھا کہ انہوں نے کبھی خضر سے کوئی کام کرنے کو کہا ہو اور اس نے کرنے سے انکار کر دیا ہو اور اب جب سے وہ عملی زندگی میں داخل ہوا تھا وہ پہلے سے بھی زیادہ ان کا خیال رکھنے لگا تھا۔

اس روز وہ شام کو گھر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا جو اس نے آتے ہی امی جان کو پکڑا دیا۔ دادی جان تب ان کے پاس ہی دوسری چارپائی پر بیٹھی تھیں انہوں نے اپنی عادت کے مطابق نہایت تجسس سے شاپر کو دیکھا۔ مگر بولی کچھ نہیں۔ امی جان نے شاپر کھولا تو اس میں تین انتہائی خوب صورت اور قیمتی سوٹ تھے۔

"یہ کس کے لیے ہیں؟" امی جان نے حیرت سے سوال کیا۔

"فیروزی اور سبز آپ کے لیے اور یہ سرخ والا نائمہ کے لیے۔"

اس نے سکون سے بتایا اور جوتوں کے تسمے جھک کر کھولنے لگا۔

"یہ تو بہت قیمتی ہیں خضر!" امی جان کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا تھا۔

www.pkdigest.com

کو دیا۔ میں ہوتے چاہیے تھے اگر میری پیاری سی ماں اور بہن نے پہننے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولا تھا۔

"اور میرے لیے کچھ نہیں لائے؟" دادی جان سے اب مزید برداشت نہیں ہو سکا تھا اس لیے بول پڑیں۔

"آپ ان میں سے ایک لے لیں ماں جی۔" اپنی فطری اچھائی کی وجہ سے امی جان نے فوراً ہی اپنے والے دونوں سوٹ سامنے رکھ دیے تھے وہ صبح والا دادی کا انداز یکسر فراموش کر چکی تھیں۔

"نہیں امی جان!" خضر نے فوراً ٹوکا۔ "یہ دونوں سوٹ میں نے آپ کے لیے خریدے ہیں اور آپ ہی انہیں پہنیں گی۔" اس کا انداز دو ٹوک تھا۔ امی جان نے مزید کچھ نہیں کہا اور تینوں سوٹ شاپر میں ڈال دیے۔

"دادی جان! آپ کے لیے میں اگلی بار اچھا سا سوٹ لے آؤں گا۔" کمرے سے باہر جانے سے پہلے اس نے خفا بیٹھی دادی کو تسلی دی تھی۔ دادی جان تب تو خاموش رہیں مگر رات کو جب ابا جی آئے تو ان کے سامنے فوراً ہی خضر کی شکایات کا دفتر کھول دیا۔ خضر تب کچن میں امی جان کے قریب کھڑا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ آج اگر ابا جی نے اس بارے میں کچھ کہا تو وہ بھی خاموش نہیں رہے گا۔ مگر اسے اس وقت حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ جب ابا جی دادی کی شکایات کے جواب میں ایک لفظ بھی نہیں بولے اور خاموشی سے صبح والے اخبار کا مطالعہ کرتے رہے بعد میں خضر دیر تک ان کے اس رویے کے بارے میں سوچتا اور الجھتا رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

ڈیڑھ سال بعد خضر کو ایک بہت اچھے سافٹ ویئر ہاؤس میں ڈیٹا بیس ایڈمنسٹریٹر کی جاب مل گئی۔ اب نا صرف اس کی تنخواہ پہلے سے تین گنا تھی بلکہ اسے ایک ایسا کیریئر پاتھ بھی مل گیا تھا۔ جس پر چلتے ہوئے وہ بہت تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر سکتا تھا اور اپنی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ اجاگر بھی کر سکتا تھا۔ ماہ نور بھی اب ہاؤس جاب شروع کر چکی تھی اور خضر کے خیال میں اب وہ وقت آ گیا تھا کہ اسے اپنے گھر میں ماہ نور کے لیے بات کر لینی چاہیے تھی۔

جن دنوں میں وہ اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا اچانک ہی بڑی پھپھو اپنی بیٹی کے لیے اس کا رشتہ مانگنے آ گئیں۔ یہ سنتے ہی خضر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ابا جی اپنی بہنوں کی بات کافی مانتے تھے اور خضر نہیں چاہتا تھا کہ شادی والے معاملے میں اسے گھر میں کوئی لڑائی جھگڑا کرنا پڑے۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی کسی اور کے کچھ بولنے سے پہلے امی جان نے ہی صاف انکار کر دیا۔

"خضر نے ایم ایس سی کیا ہے اور آپ کی بیٹی نے میٹرک بھی مشکل سے ہی پاس کیا ہے۔ ان دونوں کا جوڑ کسی طرح سے بھی مناسب نہیں ہے۔" خضر نے بے حد حیرت سے امی جان کو اتنے اعتماد سے بولتے دیکھا تھا اور مزید حیرت اسے اس وقت ہوئی جب ابا جی نے پھپھو کی ایک لمبی تقریر کو اپنی مخصوص خاموشی سے سننے کے بعد سنجیدگی سے کہا۔

"میرے خیال سے نفیسہ نے ٹھیک کہا ہے۔ خضر اور فریحہ کی شادی کسی صورت ممکن نہیں ہے۔" اپنی بات کہہ کر وہ ہمیشہ کی طرح وہاں سے اٹھ کر چلے گئے پھوپھو بھی شاید صدمے کے زیر اثر تھیں اس لیے انہوں نے بھی مزید کچھ نہیں کہا۔

"آپ نے بہت اچھا کیا امی جان! جو پھوپھو کو انکار کر دیا فریحہ کے ساتھ شادی کرنے سے بہت اچھا ہے کہ بندہ کنوارا ہی مر جائے۔" پھوپھو کے جانے کے بعد خضر نے ہنس کر کہا تھا۔ امی جان بھی مسکرانے لگیں اور اس سے پوچھا۔

"اچھا پھر تمہیں کیسی لڑکی پسند ہے۔"

"مجھے!" وہ آنکھوں کو میچ کر بہت دلکش سے مسکرایا تھا۔

"جس کی آنکھیں جھیل جیسی گہری ہوں جس کا چہرہ بچوں کی طرح معصوم ہو اور جب وہ بولے تو دل

چاہے کہ سب سنتے ہی جاؤ۔ جو سب کے لیے اچھا سوچتی ہو اچھا بولتی ہو اور جس کے قریب بیٹھو تو دل کو سکون ملے۔" وہ بہت جذب کے عالم میں بول رہا تھا۔ امی جان کو اس کے انداز نے خدشات میں مبتلا کر دیا۔ جنہیں ذہن سے جھٹکنے کے لیے انہوں نے مصنوعی بشاشت کا سہارا لیا۔

"تم تو ایسے بول رہے ہو جیسے وہ لڑکی تمہارے سامنے بیٹھی ہو۔" وہ خضر کے چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ جس پر بڑی انوکھی سی مسکراہٹ تھی اور اس کی آنکھوں میں چراغ سے جل رہے تھے۔

"آف کورس! امی جان میں اسے اپنے سامنے ہی دیکھ رہا ہوں۔ بلکہ وہ تو ہر پل میرے سامنے ہی رہتی ہے۔"

"اچھا کوئی آئیڈیل کا چکر ہے۔" انہوں نے خود کو تھوڑا سا پرسکون محسوس کیا تھا۔

"نہیں آئیڈیل نہیں جیتی جاگتی لڑکی ہے۔ ماہ نور نام ہے اس کا ایم بی بی ایس کرنے کے بعد اب ہاؤس جاب کر رہی ہے اور مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ بلکہ بہت زیادہ اچھی لگتی ہے۔" وہ پورے اعتماد اور سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ آج قدرت نے اسے ایسا موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ امی جان سے اس بارے میں بات کر سکتا تھا۔ تو وہ اس موقعے کو ضائع کیوں کرتا۔ اس لیے اس نے اپنے من کی بات سچ سچ بتا دی تھی۔ امی جان کا چہرہ اس کی بات سن کر متغیر سا ہو گیا۔ کتنی ہی دیر تک وہ کچھ بول نہ سکیں بس خالی خالی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھے گئیں۔ پھر جیسے بولنے کے لیے انہوں نے اپنی ہمت جمع کی تھی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو خضر! یہ ماہ نور کون ہے۔ تم اس سے کہاں ملے؟ تم مجھ سے جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟"

"میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں امی جان! ماہ نور میرے ایک دوست کی چھوٹی بہن ہے اور میں اس سے بہت پیار کرتا ہوں آج سے نہیں پچھلے ساڑھے چار سال سے وہ بہت اچھی ہے امی جان بہت پیاری آپ اس سے ملیں گی تو آپ کو بھی وہ بہت اچھی لگے گی۔"

"بس کرو خضر!" وہ ایک دم غصے سے چلا اٹھیں خضر نے پریشان ہو کر ان کی صورت دیکھی۔ اس نے انہیں شاذ و نادر ہی کبھی غصے میں دیکھا تھا اور اتنے شدید غصے میں تو کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔

"ایسا خیال بھی کبھی اپنے دل میں نہ لانا۔ کبھی سوچنا بھی نہیں کہ میں اس لڑکی سے تمہاری شادی کر دوں گی۔ تمہاری شادی وہاں ہو گی جہاں میں چاہوں گی۔"

"امی جان! آپ ایک بار اس سے مل تو لیں مجھے یقین ہے اس سے ملنے کے بعد آپ۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر دھاڑی تھیں۔

"نہ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں اور نہ ہی دوبارہ اس کا ذکر سننا چاہتی ہوں۔ اگر تم نے ایسا کیا تو اپنی جان دے دوں گی۔"

وہ ہسٹریائی انداز سے چلا رہی تھیں۔ خضر ہکا بکا سا رہ گیا۔ اس نے آج تک امی جان کا یہ انداز نہیں دیکھا تھا۔ وہی تو اس کا سب سے مضبوط آسرا تھیں۔ اس کی ساری امیدیں ہی ان سے وابستہ تھیں۔ اگر وہی اس کے راستے میں دیوار بن رہی تھیں تو پھر کسی اور سے وہ کیا توقع رکھ سکتا تھا۔ اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

✡ ✡ ✡

اگلے روز اس نے ماہ نور کو امی جان کے رد عمل کے بارے میں بتایا تو قدرتی طور پر وہ پریشان تو ضرور ہوئی مگر اپنی پریشانی اس نے خضر پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ بلکہ اسے دلاسا دینے کو بولی۔

"ہمت نہ ہاریں۔ اصل میں آپ نے پہلی بار ان سے یہ بات کی ہے اس لیے قدرتی طور پر انہیں دھچکا لگا ہے اور یہ بالکل نیچرل ہے۔ کیونکہ ہمارے معاشرے میں والدین کی اکثریت یہ ہی خواہش رکھتی ہے کہ اپنے بچوں کی شادیاں اپنی مرضی اور پسند سے کریں۔ خود عمران بھائی کی شادی کے وقت پاپا نے اچھی خاصی

www.pkdigest.com

مزاحمت کی بھی حالانکہ وہ میری چچازاد نازش کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے۔ جو پاپا کو بھی پسند تھی۔ پھر بھی انہیں یہ برا لگا تھا کہ ان کا بیٹا اپنی مرضی کر رہا ہے۔ کیونکہ زیادہ تر والدین بچوں کے لیے ملکیت کا بڑا عجیب اور مضبوط احساس رکھتے ہیں آپ نرمی اور پیار سے امی جان کو قائل کرنے کی کوشش کریں۔ انہیں یقین دلائیں کہ صرف اپنی پسند کی شادی کر لینے سے آپ ان سے دور نہیں ہو جائیں گے اور نہ ہی ان کی فرمانبرداری چھوڑ دیں گے۔"

وہ بہت نرمی اور سکون سے اسے سمجھا رہی تھی اور اس کے یوں سمجھانے سے خضر کو تقویت کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ بہت عقیدت اور پیار بھری نظروں سے ماہ نور کو دیکھ رہا تھا ساڑھے چار سالوں کے ساتھ میں اس نے ماہ نور کے بے شمار روپ دیکھے تھے۔ کبھی وہ ایک ہمدرد دوست کی طرح نظر آتی اور کبھی نخریلی محبوبہ بن کر اس کا ناک میں دم کر دیتی بعض اوقات وہ ایک رہنما ایک استاد کی طرح اسے سمجھاتی اور کسی دوسرے وقت خود کسی ننھی بچی کی طرح اپنا کوئی معمولی سا مسئلہ لے کر اس کے سامنے واویلا کرتی پائی جاتی۔ خضر کو اس کا ہر روپ ہی پیارا لگتا تھا۔ حتیٰ کہ جب کبھی وہ غصے سے بول رہی ہوتی اسے تب بھی اچھی لگتی۔ کیونکہ اسے پتا ہوتا تھا کہ ماہ نور کا غصہ کڑھی کے ابال جیسا ہے۔ چند لمحوں بعد ہی اسے احساس ہو جاتا تھا کہ وہ غصہ دکھا کر غلط کر رہی تھی اور ایسے میں وہ نا صرف یہ کہ فوراً معافی مانگ لیا کرتی تھی بلکہ اپنے غصے کی تلافی کی ہر ممکن کوشش بھی کیا کرتی تھی۔

"ٹھیک ہے نور! میں ایسا ہی کروں گا اور امی جان سے دوبارہ بات کروں گا۔" ایک گہرا سانس لے کر اس نے رضامندی کا اظہار کیا تھا۔

"دوبارہ نہیں خضر!" وہ زور دے کر بولی۔ "آپ ان سے بار بار بات کریں۔ دن میں جتنی بار بھی موقع ملے اتنی بار ہی ان کو منانے کی کوشش کریں۔ لیکن نرمی اور پیار سے آپ نے ان کو اس طرح سے منانا ہے کہ ان کے احساس ــــــ کو دھچکا بھی نہ لگے اور وہ رضامند بھی ہو جائیں۔"

"او کے۔" وہ دل ہی دل میں لائحہ عمل تیار کرنے لگا کہ اسے امی جان سے کس طرح بات کرنی ہے۔

اگلے ڈیڑھ ماہ تک وہ امی جان کو منانے کے جتن کرتا رہا مگر اسے ایک فیصد بھی کامیابی نہیں ہوئی وہ سخت پریشان تھا۔ امی جان کا رویہ اس معاملے میں اتنا سخت تھا کہ وہ کس طرح بھی انہیں ان کے موقف سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ ماہ نور کا ذکر سنتے ہی وہ بھتے سے اکھڑ جایا کرتی تھیں اور اکثر اوقات تو ان کا انداز ہسٹریا کے مریضوں جیسا ہو جایا کرتا تھا۔ خضر کو سب سے زیادہ ان کا یہ انداز خوفزدہ کرتا تھا۔

"یار! میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں کچھ عرصے کے لیے گھر سے کہیں چلا جاتا ہوں۔ پھر ہی امی جان کو احساس ہو گا کہ وہ کتنا غلط کر رہی ہیں۔" بالکل ہی دلبرداشتہ ہونے کے بعد اس نے ماہ نور کے سامنے اعلان کیا۔

"پاگل نہ بنیں خضر!" وہ نرمی سے بولی۔ "یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ اس طرح تو انہیں اور برا لگے گا [illegible] ہو گا انہیں کہ آپ انہیں بلیک میل کر رہے ہیں۔"

www.pkdigest.com

"ڈیڑھ ماہ ہو گیا ہے مجھے امی جان کی منتیں کرتے ان کے آگے پیچھے پھرتے کہ وہ میری بات مان لیں مگر وہ ایک انچ بھی اپنے موقف سے نہیں ہلیں جب بھی ان سے بات کرتا ہوں وہ یہی کہتی ہیں کہ تم اس کام سے ہٹ جاؤ یہ ناممکن ہے۔" وہ سخت آزردہ اور مایوس نظر آ رہا تھا۔

"آپ اپنے ابا جی سے بات کیوں نہیں کرتے۔" کچھ دیر سوچنے کے بعد ماہ نور نے کہا وہ استہزائیہ انداز سے ہنس پڑا۔

"ابا جی سے۔۔۔؟ یار کوئی عام سی بات تو انہوں نے کبھی توجہ سے سنی نہیں پھر یہ متنازعہ بات تو ضرور ہی سنیں گے اور میں ان سے اتنا فری ہوں بھی نہیں کہ براہ راست ان سے جا کر ایسی بات کر لوں۔"

"اچھا آپ ایسا کریں روبرو بات نہ کریں۔ بلکہ

انہیں خط لکھ ڈالیں اور اس خط میں اس بات کے ساتھ ساتھ وہ ساری باتیں بھی لکھ دیں جو آپ ان سے کہنا چاہتے ہیں مگر کہہ نہیں پاتے۔" وہ اب اسے نئی راہ سوجھا رہی تھی۔ خضر کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اسے بھی یہ آئیڈیا اچھا لگنے لگا۔ اپنی شادی کے علاوہ بھی کتنی باتیں تھیں جو اس نے بارہا ابا جی سے کرنا چاہیں مگر ابا جی نے کبھی اسے اتنی اجازت ہی نہیں دی کہ وہ دیر تک ان کے سامنے بیٹھے اور دوستانہ انداز سے باتیں کرے۔ مگر یہ سب کچھ وہ لکھ کر تو انہیں بتا ہی سکتا تھا۔ خط تو وہ ہر صورت پڑھ ہی لیتے۔ اس نے اس خیال پر فوراً ہی عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆ ☆ ☆

محترم ابا جی!
السلام علیکم!
میں چونکہ آپ سے براہ راست بات نہیں کر سکتا تھا اس لیے مجبوراً آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ بچپن سے لے کر آج تک کتنی بار ایسا ہوا ہے کہ میرا دل شدت سے آپ سے اپنے احساسات شیئر کرنے کو چاہا اور میں نے جب ایک بار کوشش بھی کی تو ہر بار مجھے آپ کی جانب سے اتنا سرد جواب ملا کہ میں چاہ کر بھی آپ سے وہ سب نہیں کہہ پایا جو کہنا چاہتا تھا اور یوں دھیرے دھیرے میں نے آپ سے کچھ شیئر کرنے کا خیال ہی اپنے دل سے نکال دیا۔ مگر آج ایک بار پھر میں یہ ہمت کر رہا ہوں کیونکہ آج مجھے جو مشکل درپیش ہے اس سے نکلنے کے لیے مجھے آپ کی مدد کی انتہائی ضرورت ہے۔
شاید آپ کو یہ پڑھ کر برا بھی لگے مگر مجھے مجبور سمجھ کر معاف کر دیجیے گا۔ ابا جی! دراصل مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے اور میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ماہ نور! ڈاکٹر ہے اور میرے ایک دوست کی چھوٹی بہن ہے۔ اس سے شادی کرنے کے لیے مجھے آپ کی رضامندی اور سپورٹ درکار ہے۔ میری محبت کو وقتی ابال نہ سمجھیے گا یہ میری آپ سے التجا ہے کیونکہ میں ماہ نور سے گزشتہ چار سال سے محبت کرتا آ رہا ہوں اور آپ یقین کریں اس محبت میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہی ہوا ہے۔
آپ کی محبت اور دعاؤں کا طالب
آپ کا بیٹا خضر حسن

وہ چوتھی بار اس خط کو پڑھ رہے تھے جب ان کے سب سے قریبی دوست پروفیسر عظیم نے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ دونوں اکثر ہی رات گئے تک یہاں بیٹھک میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے دونوں کا سبجیکٹ بھی ایک تھا اور خیالات بھی بڑی حد تک ملتے جلتے تھے پروفیسر عظیم کا گھر اسی گلی میں تھا اس لیے وہ با آسانی رات گئے تک ان کے یہاں بیٹھے رہتے تھے۔ اکثر تو کوئی نہ کوئی اور دوست بھی وہاں موجود ہوتا تھا مگر آج اتفاق سے پروفیسر عظیم کی آمد کے وقت پروفیسر حسن اکیلے ہی وہاں بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھ میں کوئی کاغذ تھا اور چہرے پر بڑے عجیب سے تاثرات تھے۔

"کیا بات ہے پروفیسر صاحب! خیریت تو ہے نا آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔"

پروفیسر عظیم ان سے کچھ سال چھوٹے تھے اور کسی زمانے میں ان کے شاگرد بھی رہ چکے تھے اس لیے گہری دوستی کے باوجود وہ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔

"عجیب سی بات ہے یار! لو یہ خط پڑھو۔"

گہرا سانس لے کر انہوں نے پروفیسر عظیم کی جانب دیکھا اور خضر کا خط ان کی جانب بڑھا دیا انہوں نے خط پروفیسر حسن کے ہاتھ سے لے کر پوری توجہ سے پڑھا پھر ان کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگے۔

"آپ کو یہ خط پڑھ کر برا لگا ہے۔"

"برا؟" وہ جیسے کسی دھیان سے چونکے تھے مگر بس ایک پل کے لیے دوسرے ہی لمحے وہ پھر وہیں گم ہو چکے تھے اور کھوئے کھوئے انداز سے بولے تھے۔

"مجھے تو حیرت ہو رہی ہے عظیم! کہ میری اولاد میں سے کسی کو محبت ہو گئی ہے بلکہ سچ کہوں تو مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے یہ محسوس کر کے کہ میرا بیٹا میرا خضر کسی سے محبت کرتا ہے اور وہ بھی پچھلے چار سال

سے وہ بہت ساری باتوں میں مجھ پر گیا ہے۔"

"پھر آپ نے اس بارے میں کیا سوچا ہے۔ آپ خضر کی شادی اس لڑکی سے کردیں گے جس کا اس نے خط میں ذکر کیا ہے۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پروفیسر عظیم نے ان سے سوال کیا تو وہ ایک بار پھر چونک کر اپنے خیالات سے باہر آئے تھے ان کا یہ انداز پروفیسر عظیم کے لیے بالکل نیا تھا انہوں نے کبھی انہیں یوں کھوئے کھوئے انداز میں نہیں دیکھا تھا اس لیے انہیں حیرت ہو رہی تھی لیکن اپنی حیرت کا اظہار انہوں نے نہیں کیا۔

"کیوں نہیں میں خضر کی محبت کو اس سے دور ہرگز نہیں کروں گا۔ لیکن پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ خضر اس لڑکی سے کتنی محبت کرتا ہے۔ کیونکہ محبت کی شادی کتنے ہی سیدھے طریقے سے کیوں نہ ہو جائے اس کے بعد کچھ نہ کچھ مشکلات تو ضرور آتی ہیں۔ جو خضر اور ماہ نور کو بھی درپیش ہوں گی۔ کیا خضر اور ماہ نور ان مشکلات کو اس طرح سے فیس کریں گے کہ ان کی محبت بھی متاثر نہ ہو اور معاشرتی زندگی کا وقار بھی برقرار رہے۔"

"تو پھر آپ خضر سے کب یہ سب باتیں ڈسکس کریں گے۔" پروفیسر عظیم کو قدرتی طور پر دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔

"بہت جلد۔" انہوں نے بلا تامل کہا تھا۔ "مگر خضر سے بات میں نہیں تم کرو گے۔ مجھ سے وہ اتنا فری نہیں ہے۔ اس لیے شاید کھل کر کچھ نہ کہہ سکے لیکن مجھے یقین ہے کہ تم اس سے بہت اچھی طرح بات کرلو گے۔"

"میں؟" پروفیسر عظیم بے حد حیران ہوئے تھے۔ اپنے ذاتی معاملات پر کبھی بات نہ کرنے والے اپنے استاد اور دوست سے انہیں ہرگز بھی یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اتنے اہم گھریلو معاملے میں انہیں شامل کریں گے۔

"ہاں تم۔" ان کا انداز اب ہمیشہ والا دو ٹوک تھا۔ پروفیسر عظیم نے فوراً ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے میں کل ہی خضر سے بات کرلیتا ہوں۔"

☼ ☼ ☼

"نور! بہت خوشی کی خبر ہے۔ تم سنو گی تو خوشی سے اچھل پڑو گی۔"

وہ صبح صبح ہاسپٹل جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی جب خضر کا فون آیا اور ماہ نور کی آواز سنتے ہی وہ خوشی سے چہکنے لگا۔ یہ خضر کا انداز نہیں تھا۔ اس لیے ماہ نور کو حیرت بھی ہو رہی تھی کہ وہ غضب کا متحمل مزاج تھا اور ہر طرح کی صورت حال میں خود پر قابو رکھا کرتا تھا مگر آج اس کا انداز ہی الگ تھا۔

"ایسی کیا بات ہے جو آپ اتنا خوش ہو رہے ہیں۔" اس نے مسکرا کر حیرت سے پوچھا۔

"ابا جی مان گئے ہیں۔" خضر کا انداز دھماکہ کرنے والا تھا ماہ نور واقعی حیرت اور خوشی سے اچھل پڑی۔

"واقعی! سچ کہہ رہے ہیں نا کیسے مانے وہ؟" اب وہ خضر سے بھی زیادہ بے تابی کا مظاہرہ کررہی تھی۔

"میں نے ان کے نام خط لکھا تھا اور دو دن پہلے ان کی رائٹنگ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ ابا جی نے وہ خط پڑھ کر عظیم انکل کو مجھ سے بات کرنے کے لیے کہا کل انہوں نے مجھ سے بڑی تفصیلی بات کی اور کہا کہ میں تمہارے ابا جی سے بات کرکے تمہیں فون کروں گا اور ابھی کچھ دیر پہلے ان کا فون آیا ہے رات ان کی ابا جی سے بات ہوئی ہے اور ابا جی مان گئے ہیں۔" وہ اسے بہت خوشی سے تفصیل بتا رہا تھا اور ماہ نور کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خوشی سے قہقہے لگائے۔

"سچ خضر! مجھے تو یقین نہیں آرہا کہ اتنا مشکل مرحلہ اتنی آسانی سے طے ہو گیا ہے۔"

"جناب یہ سارا میرے طرز تحریر کا کمال ہے۔ میں نے وہ خط ہی اتنا اچھا لکھا تھا کہ ابا جی کو ماننا ہی پڑا۔" خضر نے شوخی سے کہا۔

"اچھا جی اور خط لکھنے کا مشورہ کس نے دیا تھا۔ آپ جناب تو گھر چھوڑ کر جانے کو تلے بیٹھے تھے۔" ماہ

نور نے فوراً ہی بتایا تھا۔ خضر ہنس پڑا۔

"اس میں کیا شک ہے جان! صرف یہی نہیں میری ہر کامیابی کے پیچھے ہی تمہارا ہاتھ ہے۔ خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی۔" وہ بہت پیار سے بولا۔

"بس اب امی جان کو منانے کا مرحلہ سر کرنا ہے۔ عظیم انکل کہہ رہے تھے کہ مان تو وہ تمہارے ابا جی کے کہنے سے بھی جائیں گی مگر بہتر ہے کہ تم خود انہیں پیار سے مناؤ کیونکہ شادی کے بعد تمہاری بیوی کا ان کے ساتھ زیادہ وقت گزرے گا اس لیے ضروری ہے کہ وہ دل سے رضامند ہوں۔"

"اب تو میرا خیال ہے وہ مان ہی جائیں گی جب انہیں یہ پتا چلے گا کہ آپ کے ابا جی مان گئے ہیں۔" ماہ نور نے لاپروائی سے کہا تھا وہ اتنی خوش تھی کہ اب اسے کوئی بھی مسئلہ مسئلہ نہیں لگ رہا تھا۔

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔" خضر کا انداز ذرا مبہم تھا۔

"اب اگر تم چاہو تو عمران بھائی کو بتا دو ابا جی کے مان جانے کا میرا خیال ہے کہ اب زیادہ وقت نہیں لگے گا۔"

"ٹھیک ہے میں انہیں آج ہی بتا دیتی ہوں۔" ماہ نور نے کہا اور فون بند کرنے کے بعد اسی وقت عمران کو بتانے کے لیے چل پڑی۔

☼ ☼ ☼

اگلے کئی ہفتوں تک وہ دونوں ہی بے حد خوش رہے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا کہ ان کی منزل ان کے بالکل قریب پہنچ چکی ہے۔ وہ سارے سپنے جو پچھلے چار سالوں سے انہوں نے جاگتی آنکھوں سے دیکھے تھے اب حقیقت کا روپ دھارنے جا رہے تھے۔ ماہ نور نے عمران کو بھی بتا دیا تھا اور عمران کے ذریعے یہ بات ممی تک بھی پہنچ چکی تھی اور ممی بھی ان خوابوں میں ماہ نور کی شریک ہو چکی تھیں۔ اکلوتی بیٹی کی دھوم دھام سے شادی کرنا اور اسے اپنے گھر میں ہنستا بستا دیکھنا ان کی دیرینہ خواہش تھی۔ جس کے پورا ہونے میں اب تک

حالات رکاوٹ بنے رہے تھے اور اب جب حالات موافق ہوتے نظر آئے تھے تو قدرتی طور پر ہی وہ بے حد خوش تھیں اور تصور ہی تصور میں دن میں بیسیوں مرتبہ ماہ نور کو دلہن کے روپ میں دیکھنے لگی تھیں۔ مگر ان سب کی یہ خوشیاں عارضی ثابت ہوئیں۔ کیونکہ اگلے کئی ہفتے تک خضر مسلسل کوشش کے باوجود اپنی امی جان کو منانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ ابتدا میں تو اس کے مسلسل اصرار کو وہ ٹالتی رہی تھیں مگر جب اس نے اپنا مطالبہ نہیں چھوڑا تو وہ ناراض ہونے لگیں اور انہوں نے اسے بات کرنے کا موقع دینا ہی چھوڑ دیا اور جو بھی اگر خضر زبردستی ان کے سامنے ماہ نور کا ذکر کرتا تو وہ اس کی بات کو صاف ان سنا کر جاتیں۔

دوسری طرف ماہ نور پر ممی کی طرف سے پریشر بڑھنے لگا تھا پہلے تو وہ دبے لفظوں میں اس سے خضر کے گھر والوں کے آنے کے بارے میں پوچھتی رہیں پھر تنگ آکر انہوں نے واضح انداز اختیار کرلیا۔ ماہ نور ان کے سامنے بہانے بنا بنا کر تھک چکی تھی اور مسلسل ٹینشن کا شکار تھی۔ اسی ٹینشن میں کتنی ہی بار وہ خضر سے بھی الجھ پڑی۔

"آپ کو کیا ضرورت تھی عظیم انکل سے یہ کہنے کی کہ آپ امی جان کو خود منائیں گے۔ اگر یہ بات آپ کے ابا جی نے ان سے کہی ہوتی تو وہ کب کی مان چکی ہوتیں۔" وہ کتنی ہی بار خضر کو یہ طعنہ دے چکی تھی۔

"یار انہوں نے مجھ سے رائے نہیں مانگی تھی سیدھا سیدھا کہا تھا کہ تمہارے ابا جی کا خیال ہے کہ اپنی امی جان کو تم خود راضی کرو پھر میں ان سے کیا کہتا۔"

وہ بار بار کی وضاحت کرتا حالانکہ وہ خود زیادہ پریشان تھا۔ ایک طرف امی جان کی ضد تھی اور دوسری جانب ماہ نور کا غصہ۔ وہ ان دونوں کو ہی ہینڈل نہیں کر پا رہا تھا ماہ نور کے کہنے پر اس نے عظیم انکل سے دوبارہ ملاقات کرکے ان سے درخواست کی کہ وہ ابا جی سے کہہ دیں کہ وہ امی کو خود ہی اس رشتے کے لیے راضی کرلیں مگر جب عظیم انکل نے جواب دیا تو وہ پہلے سے بھی

www.pkdigest.com

زیادہ مایوسیوں میں گھر گیا۔

"تمہارے ابا جی ان سے کئی بار کہہ چکے ہیں کہ ہم اپنے بیٹے کی خوشی کی خاطر یہ شادی کر دیتے ہیں۔ مگر وہ کسی صورت یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ تو خود کل پریشان ہو رہے تھے کہ کیا کریں۔ تمہاری امی اس معاملے میں حد سے زیادہ بڑھ چکی ہیں۔"

عظیم انکل کی کہی ہوئی باتیں خضر نے ماہ نور کو بتائیں تو شدید مایوسی اور ٹینشن کا شکار ہو کر وہ اس پر الٹ پڑی۔

"بس یہی ہے آپ کی محبت' ہر وقت مجبوریوں کی داستان سناتے رہتے ہیں۔ اگر آپ کو پتا تھا کہ آپ اپنی امی کو نہیں منا سکیں گے تو مجھے یہ کیوں کہا کہ گھر میں بتا دوں۔ اب وہ لوگ بار بار مجھ سے سوال کرتے ہیں میں ان کو کیا جواب دوں' کہاں تک ان کے سامنے بہانے بناؤں۔"

"نور! میں کوشش تو کر رہا ہوں اور کیا کروں؟"

اپنی تمام تر پریشانی کے باوجود وہ نرمی سے بولا تھا مگر اس کے جواب نے ماہ نور کا غصہ مزید بڑھا دیا۔

"خاک کوشش کر رہے ہیں آپ ڈھنگ سے کوشش کی ہوتی تو کوئی نتیجہ سامنے نہ آتا۔"

"مجھ سے اس طرح بات نہ کرو نور! میں پہلے ہی ٹینشن میں ہوں۔"

"تو اور کس طرح بات کروں' میری پریشانی کا کوئی احساس ہے آپ کو' میری پوزیشن کس قدر آکورڈ ہو چکی ہے۔"

ماہ نور کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"اچھا تم بتاؤ میں کیا کروں۔ پستول لے کر امی جان کے سامنے کھڑا ہو جاؤں کہ یا تو وہ مان جائیں نہیں تو میں ان کے سامنے جان دے دوں گا۔" خضر بھی کہاں تک برداشت کرتا' اسے بھی غصہ آگیا۔

"آپ کچھ نہ کریں میں ممی سے کہہ دیتی ہوں وہ جہاں چاہیں میری شادی کر دیں۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے نور! جو تم اس طرح کی باتیں کر رہی ہو۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں اگر اگلے اتوار تک آپ کی طرف سے کوئی نہیں آیا تو میں ممی سے ہی کہوں گی۔"

"نور! تم......" خضر کا ضبط بالکل ہی جواب دے گیا۔

"اگر تم نے یہی سب کرنا ہے تو شوق سے کرو۔ میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ تمہیں بھی چھوڑ دوں گا اور ان سب کو بھی۔" غصے سے کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ ماہ نور نے گھبرا کر دوبارہ نمبر ملایا مگر خضر نے موبائل ہی آف کر دیا تھا۔ بعد میں وہ کتنی ہی دیر تک ٹرائی کرتی رہی مگر اس کا موبائل بند ہی رہا۔

☆ ☆ ☆

فون بند کر کے اس نے اپنی جیب میں ڈالا اور اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اس کی اس کوشش کا نتیجہ الٹا نکلا اور اس کا غصہ پہلے سے بھی بڑھ گیا۔ اسے عام طور پر زیادہ غصہ نہیں آیا کرتا تھا۔ مگر ان دنوں حالات ایسے ہو گئے تھے کہ وہ بہت کوشش کر کے بھی اپنے آپ کو نارمل نہیں رکھ پا رہا تھا۔ ایک طرف ماں کی محبت تھی جس کا سوال انہوں نے آج تک کسی سے کرنا تو ایک طرف کرنے کا بھی سوچا بھی نہیں تھا۔ دوسری جانب ماہ نور تھی جو اسے بے حد عزیز ہو چکی تھی اور جس کی آنکھوں میں آنسو دیکھنا اس کے بس میں نہیں تھا اور اب تقدیر اس کو ایسے موڑ پر لے آئی تھی کہ اس کی یہ دونوں عزیز ہستیاں اسے اپنی اپنی محبت سے بلیک میل کرنے لگی تھیں۔ کچھ عرصے تک تو اس نے یہ صورت حال بھی برداشت کر لی تھی مگر اب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

وہ کمرے سے باہر آیا تو امی جان کچن میں برتن دھو رہی تھیں۔ وہ ان کے قریب جا کر کھڑا ہوا تو انہوں نے بس ایک بار گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ حالانکہ چھٹی کا دن تھا اور کم از کم اس دن وہ خضر کو اس کی پسند کا ناشتا ضرور اہتمام سے کروایا کرتی تھیں اور جس چیز کی بھی وہ فرمائش کرتا وہ اسے وہی بنا کر دیتی تھیں مگر آج وہ دل ہی دل میں اس سے ناراض تھیں اس لیے اس سے نہ ناشتے کا پوچھا اور نہ ہی کوئی اور بات کی۔

"آپ ماہ نور کے گھر میرا رشتہ لے کر جائیں گی یا نہیں۔"

کچھ دیر خاموش کھڑا رہنے کے بعد وہ بولا تو اس کا لہجہ عام حالات کے برعکس درشت اور انداز دو ٹوک تھا۔ امی جان کا چہرہ ایک پل کے لیے متغیر ہوا۔ خضر نے آج تک ان سے ایسے انداز میں بات نہیں کی تھی۔ انہوں نے رخ موڑ کر ملامتی نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور سرد لہجے میں بولیں۔

"نہیں میں نہیں جاؤں گی۔"

وہ رخ پھیر کر دوبارہ سے برتن دھونے لگیں اس لمحے انہوں نے خضر کی آنکھوں کو بھیگتے دیکھا ہوتا تو شاید نرم پڑ جاتیں مگر وہ اب اس کی طرف دیکھ ہی نہیں رہی تھیں۔ وہ چند لمحے وہاں کھڑا رہا پھر خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد انہوں نے اسے تیار ہو کر گھر سے باہر جاتے دیکھا تو ان کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ وہ بغیر ناشتے کے گھر سے باہر نہیں جاتا تھا اور آج وہ دن کے دس بجے بھوکا ہی گھر سے نکل گیا تھا۔ ان کا دل چاہا وہ اسے روک لیں اسے واپس بلا لیں مگر پھر ناراضی اتنی غالب آگئی تو وہ سر جھٹک کر اپنے کاموں میں لگ گئیں۔

☆ ☆ ☆

شام کے سائے گہرے ہونا شروع ہوئے تو ان کا دل بھی ڈوبنے لگا۔ خضر اب تک گھر نہیں آیا تھا۔ انہیں اب خود پر غصہ آنے لگا کہ بھلا کیا ضرورت تھی صبح ہی صبح اس کا موڈ خراب کرنے کی کم سے کم اسے ناشتا ہی کروا دیا ہوتا۔ انہیں اچھی طرح سے پتا تھا کہ وہ باہر کی چیزیں نہیں کھاتا تھا۔ چاہے کتنی ہی دیر سے لوٹتا کھانا وہ گھر آکر ہی کھایا کرتا تھا۔ اس لیے اب انہیں یہ پریشانی بھی گھیر رہی تھی کہ اس نے پتا نہیں کچھ کھایا بھی ہو گا کہ نہیں جوں جوں وقت گزر رہا تھا ان کا حوصلہ جواب دیتا جا رہا تھا۔ کتنی ہی بار انہوں نے اسے فون کرنے کی بھی کوشش کی مگر اس کا موبائل بند جا رہا تھا۔

"پتا نہیں کہاں مارا مارا پھر رہا ہو گا؟" رات گئے جب وہ اندر باہر کے چکر کاٹ کر تھک گئیں تو کمرے میں بیٹھ کر رونے لگیں انہیں خضر بے تحاشا یاد آ رہا تھا۔ اس کی باتیں' اس کا اپنے آس پاس پھرنا' چھوٹی چھوٹی چیزوں میں بھی ان کا خیال رکھنا' وہ کبھی ان کے ساتھ اونچی آواز میں نہیں بولا تھا۔ حتیٰ کہ پچھلے بہت سارے دنوں میں ان کے ساتھ اپنی شادی کی بات کرتے ہوئے بھی وہ کبھی غصے میں نہیں آیا تھا۔ ہمیشہ نرمی اور تحمل سے ہی بات کرتا رہا تھا۔ انہیں ملال گھیر رہا تھا اور پہلی بار وہ سوچ رہی تھیں کہ اگر خضر کی جگہ ناصر ہوتا تو کیا اتنے عرصے تک اتنے تحمل کا ثبوت دے سکتا تھا۔ وہ تو دو ہی روز میں اکتا جاتا اور اپنی بات منوانے کے لیے ہر حد سے گزر جاتا اور خضر نے تو اپنا کیریئر بن جانے تک اس بات کا کبھی تذکرہ بھی نہیں کیا تھا۔

"کیا بات ہے نفیسہ کیوں رو رہی ہو؟" پروفیسر حسن رات گئے کمرے میں آئے تھے اور انہیں روتا دیکھ کر اپنی عادت کے خلاف پوچھ رہے تھے وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئیں اور دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھوں کو خشک کرتے ہوئے بولیں۔

"خضر گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔"

"کیا؟" وہ حیران ہوئے تھے۔ انہوں نے آج تک خضر کے حوالے سے ایسی بات نہیں سنی تھی جس میں شکایت یا لڑائی کا عنصر رتی بھر بھی ہو۔ وہ بہت کم گو اور خیال رکھنے والا لڑکا تھا۔ حتیٰ کہ بہت چھوٹا ہوتے ہوئے بھی وہ کسی سے نہیں لڑا کرتا تھا۔ اس لیے اس کا گھر چھوڑ کر چلے جانا ان کے لیے اچھا خاصا شاک تھا۔

"کوئی بات ہوئی تھی۔ کیوں چلا گیا؟" خود پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے سوال کیا تو نفیسہ نے صبح والی گفتگو انہیں سنا دی۔

"مجھے اس کے لہجے پر غصہ آگیا تھا اس لیے جب وہ جا رہا تھا تو میں نے اسے نہیں روکا۔" وہ افسردگی سے

www.pkdigest.com

بولی تھیں۔ پروفیسر حسن کا چہرہ رنج و غم کی تصویر بن گیا۔

"برا کیا نفیسہ! تم نے بہت برا کیا۔" وہ شکستہ لہجے میں بولے تھے۔

"اپنے بیٹے کا دل توڑ دیا اور وہ بھی خضر جیسے بیٹے کا جس نے آج تک ہم سے کچھ نہیں مانگا۔ جس نے آج تک ہماری کسی بات سے انکار نہیں کیا۔ تم نے یہ اچھا نہیں کیا نفیسہ! بالکل اچھا نہیں کیا۔"

"تو میں کیا کرتی آپ تو جانتے ہیں میں نے اپنی بہن سے وعدہ کر رکھا ہے کہ اس کی بیٹی کو ہی اپنی بہو بناؤں گی۔ اب اگر میں خضر کی بات مان لیتی ہوں تو میری بہن تو چھوٹ جائے گی نا اور دنیا میں ایک ہی تو بہن ہے میری۔"

انہوں نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ اپنی بات زور دے کر کہیں مگر پھر بھی ان کا لہجہ کمزور ہی رہا تھا۔ پروفیسر حسن مدھم سا مسکرا دیے اور کہنے لگے۔

"اپنی اولاد کی خوشی کا بھی تو سوچو نفیسہ! وہ چار سال سے اس لڑکی سے محبت کرتا آ رہا ہے۔ اس نے نہ جانے اس کے حوالے سے کتنے خواب دیکھ رکھے ہوں گے۔ تم اس کے خواب کس طرح اجاڑ سکتی ہو نفیسہ! تم نے کبھی اس کی آنکھوں کی چمک پر غور نہیں کیا جو ماہ نور کے صرف نام پر ان میں آ جاتی ہے۔ تم کس طرح اس چمک کو بجھا سکتی ہو۔ اتنا حوصلہ تم کیسے کرو گی؟ غور کرو پچھلے چار سالوں میں اس میں کتنی مثبت تبدیلیاں آئی ہیں۔ وہ کتنا ذمہ دار اور پراعتماد ہو گیا ہے اس میں آگے بڑھنے کی اور ترقی کرنے کی لگن پیدا ہو گئی ہے۔ وہ پہلے سے بڑھ کر نرم خو ہو گیا ہے۔ پہلے سے زیادہ سب کا خیال رکھنے لگا ہے۔ یہ سب محبت کے کرشمے ہیں نفیسہ! محبت نے اس کی شخصیت کی مضبوطی اور خوب صورتی کو اتنا بڑھایا ہے اور آج اگر ہم نے اس سے اس کی محبت چھین لی تو وہ ٹوٹ جائے گا بکھر جائے گا اور ٹوٹی ہوئی چیزیں ہوں یا ٹوٹے ہوئے لوگ ان کو کتنی ہی محبت اور توجہ سے کیوں نہ جوڑ لو۔ وہ کبھی پہلے جیسے نہیں بن پاتے۔ ان میں بہت ساری خامیاں بہت سارے نقش رہ جاتے ہیں جو کبھی دور نہیں ہوتے۔"

وہ نہ جانے کہاں کھو کر بول رہے تھے۔ نفیسہ نے آج تک انہیں اس طرح بولتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو ہمیشہ سے ایک ایسی بند کتاب کی طرح رہے تھے جسے وہ کبھی کھول کر پڑھ نہیں پائی تھیں اور اگر یہ کتاب کبھی کھلی بھی تھی تو اس کی تحریر اتنی نامانوس تھی کہ وہ اسے سمجھ ہی نہیں پائی تھیں۔ انہوں نے غور سے پروفیسر حسن کے چہرے کو دیکھا جس پر دکھ اور غم کے ساتھ کسی ایسی حسرت کی پرچھائیں بھی تھیں۔ جو ان کے دل کو کاٹ سا گئی۔ وہ ساکت سی بیٹھی انہیں دیکھتی رہیں پھر مدھم آواز میں بولیں۔

"ٹھیک ہے۔ آپ خضر کو واپس بلا لیں۔ میں راضی ہوں۔"

"سچ کہہ رہی ہو؟"

پروفیسر حسن نے ان کی طرف غور سے دیکھا تھا۔ نفیسہ نے دیکھا ان کے چہرے پر چھائے رنج و غم کے بادل اب چھٹ گئے تھے۔ مگر وہ نامعلوم سی حسرت اب بھی ان کی کشادہ آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔ حالانکہ اب وہ مسکرا رہے تھے۔

"جی۔" آہستہ آواز میں کہہ کر انہوں نے پروفیسر حسن کے چہرے سے نظریں چرائی تھیں۔

☼ ☼ ☼

خضر نے اگلا دن بھی موبائل آن نہیں کیا حالانکہ دفتر کے کسی کام میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا مگر وہ خود پر جبر کیے رہا۔ شام پانچ بجے کے قریب جب وہ دفتر سے اٹھنے کا سوچ رہا تھا دفتر کے نمبر پر ابا جی کی کال آ گئی۔ ایک لمحے کے لیے اسے افسوس سا ہوا کہ اس نے موبائل آن ہی کر لیا ہوتا تو ابا جی کو اس کے دفتر کا نمبر ڈھونڈنے کی تکلیف نہ اٹھانا پڑتی۔

"کیسے ہو بیٹا؟"

اس نے ڈرتے ڈرتے سلام کیا تھا اسے پورا یقین تھا کہ ابا جی اسے ڈانٹیں گے مگر وہ تو بہت شفقت سے اس کی خیریت دریافت کر رہے تھے۔ خضر حیرت سے

بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔

"ٹھیک ہوں ابا جی۔"

"گھر کیوں نہیں آئے کل سے تمہاری ماں بہت پریشان ہے۔ رات بھر جاگتی رہی ہے۔ دیکھو بیٹا! تم ماشاء اللہ پڑھے لکھے اور سمجھدار ہو۔ تمہیں سوچنا چاہیے کہ فرار کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔ اپنی ماں کو پیار سے نرمی سے مناؤ گے تو وہ مان جائیں گی۔ تم گھر آ جاؤ۔" وہ اب اسے سمجھا رہے تھے خضر کے تصور میں امی جان کا مرجھایا ہوا افسردہ چہرہ آیا تو اس کا دل گھبرانے لگا۔

"جی آ جاتا ہوں۔" وہ مدھم آواز میں بولا تھا۔

"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" ابا جی نے کہہ کر فون بند کر دیا تو وہ حیران سا کتنی ہی دیر تک وہیں بیٹھا رہا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابا جی بھی اس طرح بات کر سکتے ہیں۔

"ابا جی اگر آپ لوگوں سے دور رہتے ہیں تو آپ خود کیوں نہیں بیچ کا فاصلہ طے کر کے ان کے قریب ہونے کی کوشش کرتے۔" اسے ماہ نور کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی تھی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے مسکرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ گھر پہنچا تو امی جان اپنے کمرے میں چارپائی پر بیٹھی تھیں خضر کو دیکھ کر ان کے چہرے پر رونق آ گئی۔ خضر بے اختیار ہی ان کے قدموں میں جا بیٹھا اور اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔

"مجھے معاف کر دیں امی جان! میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بالکل نہیں رہ سکتا۔" وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح منہ بسورتے ہوئے بول رہا تھا۔

"پھر گھر چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے۔" اس کے بالوں میں محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے امی جان کا اپنا لہجہ بھی گلوگیر سا ہو گیا۔

"میں نے غلط کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں کچھ دن آپ سے دور ہو کر رہ لوں گا۔ مگر میں نہیں رہ سکا۔ آپ کو یاد نہیں میں تو بچپن ہی سے سارا وقت آپ کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ باقی سب بچے باہر کھیلنے چلے جاتے تھے مگر میں آپ کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ پھر میں اب کیسے آپ سے دور ہو سکتا ہوں۔ میں آپ سے بہت پیار کرتا ہوں امی جان بہت پیار کرتا ہوں۔ مگر میں کیا کروں میں نور سے بھی بہت پیار کرتا ہوں میں نہ اسے چھوڑ سکتا ہوں نہ آپ کو چھوڑ سکتا ہوں۔ میں بڑی مشکل میں ہوں اور اس مشکل سے میں اس وقت نکل سکتا ہوں جب آپ میری خوشی میں خوش ہو جائیں گی۔" وہ رو پڑا تھا۔

"ٹھیک ہے بیٹا! میں تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔ بس اب چپ کر جاؤ۔" اس کا چہرہ اپنے دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے امی جان نے نرمی سے کہا تو خضر کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا۔

"آپ سچ کہہ رہی ہیں؟" اس نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا تو وہ اندر ہی اندر جزبز ہو کر رہ گئیں۔ پروفیسر حسن نے بھی بالکل یہی سوال ان سے پوچھا تھا۔

"میں نے پہلے کبھی جھوٹ بولا ہے جو اب بولوں گی۔ اب اٹھو اور منہ دھو کر آؤ میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں۔" انہوں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"تو میں نور کو بتا دوں نا۔" خضر کی آنکھیں جگر جگر کرنے لگی تھیں۔

"تم نے کبھی اس کی آنکھوں کی چمک پر غور نہیں کیا جو ماہ نور کے صرف نام پر ان میں آ جاتی ہے۔" پروفیسر حسن کی آواز ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی ان کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ ہلکے سے مسکرا دیں۔

"ہاں بتا دو ہم ان شاء اللہ اتوار کی شام کو ان کے گھر جائیں گے۔"

خضر کے بالوں کو محبت سے سہلاتے ہوئے انہوں نے نرمی سے کہا تو اپنے لہجے کی خوشی خود انہیں بھی حیران سا کر گئی۔

☼ ☼ ☼

کمرہ گلاب اور موتیا کے پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ فضا میں ایک عجیب سا طلسم چھایا ہوا تھا۔ ایک

سرخوشی اور سکون کا احساس تھا جس نے ماہ نور کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ اس کا دل اگرچہ خوشی سے لبریز تھا مگر پھر بھی ایک بے یقینی سی بھی تھی جو اس کو محسوس ہو رہی تھی اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ خضر کی ہو چکی ہے۔ اور اس کے گھر میں اس کے کمرے میں موجود ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اسے وہم سا ہونے لگتا کہ کہیں یہ سب کچھ خواب نہ ہو جو آنکھیں کھولتے ہی غائب ہو جائے۔ وہ بار بار آنکھیں بند کرتی بار بار کھولتی اور ہر بار آنکھیں کھولنے پر جب اسے وہی منظر دکھائی دیتا تو اس کا دل خوشی سے بھر جاتا اور بے اختیار ہی اپنے رب کا شکر گزار ہونے لگتا جس نے اس کی سب سے بڑی تمنا سب سے بڑی خواہش پوری کر دی تھی۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ اپنے خیالوں سے چونکی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اندر آنے والا خضر تھا جو اب اس کے بالکل سامنے آکر بیٹھ گیا تھا۔

"نور!" خضر نے اسے پکارا تو اس کا لہجہ ہمیشہ سے زیادہ محبت اور اپنائیت سے لبریز تھا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ میں نے تمہیں پالیا ہے اور تم میرے لیے سج سنور کر میرے کمرے میں بیٹھی ہو۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ کوئی خواب ہو۔"

ماہ نور نے کچھ چونک کر پلکیں اٹھائی تھیں خضر بھی وہی کچھ کہہ رہا تھا جو وہ محسوس کر رہی تھی۔ وہ اس کے بالکل سامنے بیٹھا تھا اور اس کی خوب صورت آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ماہ نور ایک پل سے زیادہ اسے نہیں دیکھ سکی اور اس نے دوبارہ پلکیں جھکا لیں۔

خضر نے نرمی سے اس کا مہندی سے رچا ہوا ہاتھ پکڑا اور نفیس سا بریسلیٹ اسے پہنانے لگا ماہ نور کو عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی حالانکہ وہی خضر تھا جس سے وہ سینکڑوں مرتبہ مل چکی تھی گھنٹوں اس کے ساتھ فون پر باتیں کر چکی تھی مگر آج اس سے خضر کے سامنے پلکیں نہیں اٹھائی جا رہی تھیں اور اس کا مہندی اور چوڑیوں سے سجا ہاتھ خضر کی نرم سی گرفت میں بھی کپکپا رہا تھا۔

"کیا ہوا نور! تم اتنا گھبرا کیوں رہی ہو؟" خضر نے اس کے ہاتھ کو نرمی سے چومتے ہوئے محبت سے پوچھا تھا ہمیشہ کی کانفیڈنٹ ماہ نور کو خود بھی اپنا یوں گھبرانا اچھا نہیں لگ رہا تھا اس لیے فوراً بول اٹھی۔

"جی نہیں میں تو بالکل نہیں گھبرا رہی۔" اپنے نہ گھبرانے کا اعلان کرتے ہوئے اس کی آواز اتنی پھنسی پھنسی نکلی تھی کہ خود اس کے کانوں کو اجنبی لگی خضر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم نہیں گھبرا رہیں مگر چلو میں تو گھبرا رہا ہوں نا مجھے بھی تھوڑا اعتماد اور حوصلہ ادھار دے دو۔" اپنے مزاج کے برعکس وہ شوخی سے بولا اور ماہ نور کا ہاتھ چھوڑ کر اسے اچانک ہی اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ اس کا یہ عمل اتنا اچانک تھا کہ ماہ نور کو مزاحمت کا موقع ہی نہیں مل سکا اور وہ بے اختیار ہی اس کے سینے سے جا لگی۔ ایک پل کے لیے تو اس کا دل دھک سے رہ گیا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو بے حد پُرسکون اور مطمئن ہوتا ہوا محسوس کیا اور بے اختیار ہی اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے اس سکون اور خوشی کے دائمی ہونے کی دعا مانگی تھی۔

www.pkdigest.com

☆ ☆ ☆

اگلی صبح خضر کی آنکھ کھلی تو ماہ نور ڈریسنگ ٹیبل کے قریب کھڑی ہیئر ڈرائیر سے اپنے بال سکھاتے ہوئے بڑی فرصت اور توجہ سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ صبح کے مدھم اجالے میں اس کا آدھے گیلے اور آدھے سوکھے سیاہ بالوں میں گھرا ہوا آتشی چہرہ بڑا خوب صورت اور معصوم لگ رہا تھا۔ خضر کو آنکھیں کھولتے دیکھ کر اس نے جلدی سے نا صرف اپنی نظروں کا زاویہ بدل لیا بلکہ رخ بھی موڑ لیا۔ خضر اس کے انداز پر ہلکے سے ہنس دیا۔ پھر بستر سے اٹھا اور اس کی پشت پر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

"کیا ہوا جناب! یہ رخ روشن کو ہماری طرف سے موڑ کیوں لیا۔" ماہ نور جواب میں کچھ نہیں بولی اور اپنے بال سکھاتی رہی سامنے کی طرف کے بال تو سوکھ

چکے تھے اب اسے پیچھے والے بالوں کو سکھانا تھا جن کے لیے اسے ہاتھوں کو موڑ کر پیچھے لے جانا پڑتا اور اس کے عین پیچھے خضر کھڑا تھا اور بڑی شوخ نظروں سے اس کے عکس کو آئینے میں دیکھ رہا تھا۔

"لاؤ! میں سکھا دوں۔" وہ اس کی مشکل ایک پل میں سمجھ گیا اور اس کے ہاتھ سے ڈرائیر لے کر اس کے بال سکھانے لگا۔ ماہ نور کو عجیب سی فرحت اور خوشی کا احساس ہوا۔ اسے بالکل توقع نہیں تھی کہ خضر اتنے معمولی سے معاملے میں اس کی مشکل کو سمجھے گا اور اسے فوراً ہی دور بھی کرنے کا سوچے گا اسے اپنے ہمسفر پر فخر سا ہونے لگا۔ وہ بڑی محبت سے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں نظر آتے اس کے عکس کو دیکھنے لگی۔

"نور! میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔" اس کی محویت کو خضر کی سنجیدہ آواز نے توڑا تھا۔

"میں تو رات ہی کو یہ بات کہنا چاہتا تھا۔ مگر پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ تمہیں برا نہ لگے۔"

"کیسے ایسی کیا بات ہے؟" وہ کچھ حیران ہوئی تھی۔

"نور! تم جانتی ہو نا کہ امی جان ہماری شادی کے لیے بڑی مشکل سے رضامند ہوئی تھیں۔ بلکہ میں سچ کہوں تو پورے دل سے وہ ابھی بھی راضی نہیں ہیں۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد خضر نے کہنا شروع کیا تھا۔ ماہ نور بغیر پلکیں جھپکائے اور بغیر کچھ بولے اس کے عکس کو دیکھتی رہی۔

"ہو سکتا ہے کہ ان کا رویہ تم سے زیادہ اچھا نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں نور! کہ اگر ان کی طرف سے تمہیں اجنبیت محسوس ہو تو پلیز جواب میں تم ایسا نہ کرنا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے اور امی جان کے بیچ میں اجنبیت کی خلیج پیدا ہو جائے۔ اس لیے میری خاطر تم ان کا دل جیتنے کی کوشش کرنا۔ یقین کرو نور! وہ دل کی بہت اچھی ہیں۔ اگر تم ان کے ساتھ ایک اچھی بیٹی کی طرح کا رویہ رکھو گی تو وہ بہت جلد تم سے محبت کرنے لگیں گی۔"

"مجھے اس بات کا یقین ہے خضر! اور آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں امی جان کو زیادہ دنوں تک خود سے ناراض نہیں رہنے دوں گی یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔"

خضر کی طرف رخ موڑتے ہوئے وہ پورے یقین اور اعتماد سے بولی تھی۔

"تھینکس نور! تم نے میرا پوائنٹ سمجھ لیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں تمہیں برا نہ لگے کہ میں امی جان کی زیادہ ہی طرف داری کر رہا ہوں۔"

اس کے بالوں پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے وہ اطمینان سے بولا تھا۔

"اس میں برا لگنے والی کیا بات ہے۔ جب اللہ نے ماں کا رتبہ اونچا بنایا ہے تو ہم انسانوں کو اسے تسلیم کرنے میں حجت نہیں کرنی چاہیے۔ آپ پر سارا حق امی جان کا ہے اور میں اس حق کو دل سے تسلیم کرتی ہوں۔" اس کے سینے پر سر رکھتے ہوئے وہ نرمی سے بولی تھی اور خضر کے تمام خدشات کو ایک پل میں ختم کر گئی تھی۔ خضر کو اپنے انتخاب پر فخر محسوس ہوا تھا۔ اس نے نرمی سے اپنے لبوں سے ماہ نور کی چمکتی پیشانی کو چھوا اور مسکرا دیا۔

☆ ☆ ☆

خضر نے آفس سے ایک ماہ کی چھٹی لی تھی۔ شادی کے بعد گھومنے پھرنے اور دعوتوں میں اس ایک ماہ کے گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا اور اس کی چھٹی ختم ہو گئی اس روز اسے آفس جانا تھا اس لیے وہ صبح ہی صبح اپنی تیاری میں لگ گیا ماہ نور کمرے میں ادھر ادھر بکھری چیزیں سمیٹ رہی تھی۔

"نور! تم ہاسپٹل کب جوائن کرو گی؟" ماہ نور نے شادی سے کچھ ہفتے پہلے ہی ایک اچھے پرائیویٹ ہاسپٹل میں جاب شروع کی تھی۔

"ابھی سوچا نہیں ہے چھٹی تو دو ماہ کی لی تھی مگر شاید بڑھوا لوں۔"

"کیوں؟ مزید چھٹی کیا کرنی ہے؟" وہ حیران ہوا تھا۔

"اپنے گھر کے معاملات کو پہلے پوری طرح سیٹ کرنا ہے پھر باہر کے کاموں کا سوچوں گی۔" اس کی ٹالنے کی بات باندھتے ہوئے وہ لاپروائی سے بولی تھی۔

"گھر کے معاملات کون سے؟" وہ ہنوز حیران تھا۔ ماہ نور نے اس کی بات کا جواب صرف ایک معنی خیز مسکراہٹ سے دیا اور اس کے جوتے بیڈ کے قریب رکھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کا رخ کچن کی طرف تھا جہاں امی جان ناشتا تیار کر رہی تھیں۔ اسے کچن میں دیکھ کر انہیں تھوڑی سی حیرت ہوئی تھی مگر انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔

"امی جان! میں آپ کی ہیلپ کرواؤں؟" ان کے قریب کھڑی وہ بڑے دوستانہ انداز سے پوچھ رہی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ امی جان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ گفتگو کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جواب میں امی جان کا رویہ اگر سخت نہیں تھا تو کچھ خاص دوستانہ بھی نہیں تھا۔ خضر کے اندازے کے عین مطابق وہ دل سے ماہ نور کو قبول نہیں کر پائی تھیں۔ اس لیے اس کے ساتھ ۔۔۔ لیا دیا انداز ہی رکھتی تھیں۔ البتہ خضر سے چار سال چھوٹی نائمہ سے ماہ نور کی خوب دوستی ہو گئی تھی۔ اور سب سے چھوٹا خرم بھی ماہ نور کے آگے پیچھے پھرتا رہتا تھا۔ ناصر اور ابا جی گھر میں نظر ہی بہت کم آتے تھے۔

"تمہیں کچن کا کام آتا ہے؟" امی جان اس بار اپنی حیرت کو نہیں چھپا سکی تھیں۔

"جی تھوڑا بہت۔" اس نے معصومیت سے پلکیں جھپکائیں اور سنک میں پڑے برتن دھونے لگی چند منٹ میں ہی اس نے برتن دھو ڈالے اور آملیٹ کے لیے پیاز کاٹنے لگی اتنے دنوں میں یہ تو اسے پتا چل ہی گیا تھا کہ یہاں ناشتے میں سب لوگ آملیٹ اور پراٹھے کا ناشتا کرتے ہیں۔ امی جان پراٹھے بنا رہی تھیں اس لیے وہ آملیٹ بنانے لگی آملیٹ بنا کر اس نے چائے چولہے پر رکھی اور ٹیبل پر برتن لے جا کر رکھنے لگی۔

امی جان اس کے گھریلو انداز پر اتنی حیران تھیں کہ رہا" بھی اسے کسی کام سے منع نہ کر سکیں۔ جب تک گھر کے سارے افراد ناشتے کے لیے آئے سارا کام ہو چکا تھا اور آج یہ پہلا موقع تھا کہ امی جان بھی سب کے ساتھ ٹیبل پر موجود تھیں ورنہ ان سب کے ناشتا کر لینے تک وہ کچن میں ہی مصروف رہتی تھیں اور خود سب کے چلے جانے کے بعد ناشتا کیا کرتی تھیں۔ آج ماہ نور کی وجہ سے کام جلدی نبٹ گیا تھا اور چائے بھی بعد میں وہی لے کر آئی تھی اس لیے امی جان کو فراغت محسوس ہو رہی تھی اور یہ احساس انہیں بڑا اچھا لگ رہا تھا۔

ناشتے کے بعد سب لوگ چلے گئے تو ماہ نور نے ٹیبل سے برتن اٹھا کر دھوئے اور امی جان کام والی سے صفائی کروانے لگیں۔ پھر جب وہ دوپہر کا کھانا پکانے کچن میں گئیں تو وہ ایک بار پھر ان کے پاس جا پہنچی اور ادھر ادھر کی باتوں کے ساتھ اس نے ان کا خاصا کام بھی نبٹا دیا۔

شام کو خضر گھر آیا تو وہ امی جان کے پاس ہی بڑے کمرے میں بیٹھی باتیں کر رہی تھی اور امی جان کو اس نے پہلی بار ماہ نور کی باتوں میں دلچسپی لیتے دیکھا۔ ان کا موڈ بھی آج بہت خوشگوار تھا۔ خضر نے محبت سے گلابی کپڑوں میں ملبوس کھلی کھلی ماہ نور کو دیکھا اور مطمئن سا ہو کر امی جان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ ماہ نور اٹھ کر اس کے لیے چائے بنانے چلی گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

"ابا جی! چائے لے لیں۔" پروفیسر حسن تھرڈ ایئر کے پیپرز چیک کر رہے تھے جب ماہ نور ان کے لیے چائے لے کر آئی۔

"لاؤ بیٹا! اس وقت بڑی طلب ہو رہی تھی۔" وہ ہمیشہ سے ہی چائے کے رسیا تھے اور اس وقت تھکن بھی تھی اس لیے چائے دیکھ کر خوش ہو گئے۔

"جی امی جان نے کہا تھا کہ آپ کو چائے بنا کر دے آؤں۔" انہیں چائے کا کپ پکڑا کر اب وہ کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔

"واؤ ابا جی! آپ کے پاس تو بہت اچھی بکس

ہیں۔" ریک میں لگی کتابوں کو وہ بڑی ندیدی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے انداز پر پروفیسر حسن کو ہنسی آ گئی۔

"تمہیں لٹریچر سے دلچسپی ہے۔" انہوں نے سوال کیا۔

"بہت زیادہ۔" وہ اب کتابیں کھول کھول کر دیکھ رہی تھی۔

"اچھا۔" وہ تھوڑا سا حیران ہوئے۔ "حالانکہ ڈاکٹرز کو عام طور پر لٹریچر میں زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی۔"

"تو میں کوئی عام ڈاکٹر تھوڑی ہوں۔" اسے ایک انگلش ناول پسند آ گیا تھا اس لیے بڑے اشتیاق سے اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے بے نیازی سے بولی تھی پروفیسر حسن کو اس کا یہ انداز اچھا لگا ان کے تمام بچوں کے برعکس وہ ان سے بہت اعتماد سے گفتگو کیا کرتی تھی۔ اتنے دنوں میں ان کو یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ ماہ نور بہت بولتی تھی اور اس کا بولنے کا انداز ایسا ہوتا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہونے لگتی تھی۔ جس روز وہ خود کھانا پکاتی کھانے کی میز پر ایک فہرست ضرور اسے کھانے کی تعریفیں کرواتی اور صرف تعریفیں کروانے میں نہیں اسے دوسروں کی تعریفیں کرنے میں بھی بہت لطف آتا تھا۔ اس کے آنے سے گھر بھر میں ایک عجیب سی رونق ہو گئی تھی۔ وہ غیر محسوس انداز سے سب کا خیال رکھتی تھی۔ خاص طور پر امی جان پر تو اس کی سب سے زیادہ توجہ تھی۔ کبھی کبھی نائمہ اسے امی جان کی غلام کہہ کر چھیڑتی تو وہ ہنس کر کہتی۔

"بھئی ایک ہی تو ساس ہیں میری۔ اب میں ان کا بھی خیال نہ رکھوں تو کتنی بری بات ہے۔"

"اچھا تو کتنی ہونی چاہییں تھیں۔" امی جان مصنوعی خفگی سے گھورتیں تو وہ ہنس کر ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیتی نفیسہ بیگم کے موڈ پر بھی اس کے آنے سے بہت اچھا اثر پڑا تھا اور وہ جو پہلے ہر وقت خاموش خاموش اور تھکی تھکی دکھائی دیتی تھیں اب بہت فریش لگنے لگی تھیں۔ ماہ نور کے لیے ان کے دل میں جو بھی خدشات تھے سب دور ہو گئے تھے۔

"ابا جی! میں یہاں سے پڑھنے کے لیے کتابیں لے سکتی ہوں؟" وہ اب ان کے قریب کھڑی پوچھ رہی تھی۔

"بالکل بیٹا! جب بھی چاہو۔" انہوں نے مسکرا کر نرمی سے کہا تو انہیں اپنے لہجے پر خود بھی حیرت سی ہوئی وہ کبھی اپنے بچوں کے ساتھ اس نرمی سے نہیں بولے تھے کچھ تھا اس لڑکی میں جو سب سے الگ تھا اسے پیار لینا آتا تھا۔ وہ ہر کسی کی توجہ حاصل کر لینے کی قدرتی صلاحیت رکھتی تھی۔

"تھینک یو ابا جی۔" چائے کا خالی مگ اور ہاتھ میں پکڑا ناول لے کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی تھی مگر پروفیسر حسن دیر تک اس کے بارے میں سوچتے رہے۔

✡ ✡ ✡

شادی کو دو ماہ گزرے تو ماہ نور نے ہاسپٹل جانا شروع کر دیا مگر گھریلو کام وہ اب بھی انجام دے رہی تھی۔ صبح امی جان کے ساتھ مل کر ناشتا بنواتی اور رات کا کھانا خود تیار کرتی اس کے علاوہ ہر چھٹی والے دن اپنے اور خضر کے ہفتہ بھر کے دوران پہنے جانے والے کپڑے استری کرتی اور گھر بھر کی تفصیلی صفائی کام والی کے سر پر کھڑی ہو کر کرواتی۔ امی جان اب اس سے بہت خوش تھیں اور کئی مرتبہ خضر کے سامنے اس کی تعریف کر چکی تھیں۔

"یہ وہی ماہ نور ہے امی جان! جس کو آپ اس گھر میں لانے کے لیے تیار نہیں تھیں۔" خضر ان کی تعریفوں کے جواب میں چھیڑتا تو وہ ہنس کر خوش دلی سے کہتیں۔

"وہ میری غلطی تھی۔ میں نے بغیر ماہ نور سے ملے بغیر اس کو پرکھے خود ہی یہ طے کر لیا تھا کہ ماہ نور چونکہ امیر گھر کی لڑکی ہے۔ اس لیے وہ ہمارے ساتھ گھل مل کر نہیں رہے گی اور تمہیں بھی ہم سے دور کر دے گی۔

www.pkdigest.com

ماہ نور اپنے بارے میں اس طرح کی باتوں کو سنتی ضرور تھی مگر اس نے کبھی ان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا نہ سب کے سامنے اور نہ ہی تنہائی میں کبھی خضر کے سامنے۔ بلکہ خضر کے سامنے تو وہ قطعی طور پر کوئی ایسی بات نہیں کرتی تھی جو ذرا سی بھی متنازعہ ہو یا کسی بھی پہلو سے متنازعہ سمجھی جا سکتی ہو۔ وہ اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی۔ جتنی دیر وہ گھر پر رہتا ماہ نور اس کے آس پاس دکھائی دیتی تھی۔ حالانکہ خضر آفس سے آنے کے بعد تقریباً" سارا وقت امی جان کے پاس بڑے کمرے میں ہی گزارتا تھا صرف سونے کے لیے یا تیار ہونے کے لیے اپنے کمرے کا رخ کیا کرتا تھا مگر ماہ نور نے کبھی اس بات کا برا نہیں مانا تھا بلکہ وہ خود بھی کاموں سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں جانے کی بجائے امی جان کے پاس آ بیٹھتی یا پھر نائمہ سے باتیں کرتی رہتی۔

اکثر وہ نائمہ کے لیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پرانے ڈراموں کی DVD لے کر آتی اور وہ دونوں اکٹھی بیٹھ کر یہ ڈرامے دیکھا کرتی تھیں۔ اس کے اکسانے پر نائمہ کو یونیورسٹی میں ایڈمشن لینے اور آگے پڑھنے کا شوق اٹھا تھا۔ ورنہ وہ بی اے کے بعد تعلیم کا سلسلہ ختم کر چکی تھی۔ کیونکہ ان کے خاندان کی کوئی بھی لڑکی آج تک یونیورسٹی نہیں گئی تھی مگر ماہ نور دل سے چاہتی تھی کہ نائمہ آگے پڑھے اور اپنے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو اجاگر کرے۔ اس کے مسلسل سمجھانے پر اب نائمہ بھی آگے پڑھنے کے معاملے میں کافی پر جوش ہو چکی تھی۔ خضر اور امی جان کو بھی یہ بات پسند آئی تھی مگر اصل مرحلہ ابا جی سے اجازت لینے کا تھا۔ کیونکہ ان کے بارے میں کوئی بھی حتمی اندازہ قائم نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس بات کو پسند کریں گے یا نہیں۔ امی جان خضر اور خود نائمہ کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ لڑکیوں کو زیادہ پڑھانا پسند نہیں کرتے ہوں گے اسی لیے تو نائمہ کے بی اے کر کے گھر بیٹھ جانے پر انہوں نے کبھی کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ مگر ماہ نور کو پورا یقین تھا کہ ابا جی کو یہ بات اچھی لگے گی کہ ان کی بیٹی اعلا تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے۔ باقی سب اگرچہ اس سے متفق نہیں تھے مگر پھر بھی جب ماہ نور نے اس رات کھانے کی میز پر ابا جی سے یہ بات کی تو سب بہت امید بھری نظروں سے ان کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ ابا جی چند لمحے تک خاموش بیٹھے کھانا کھاتے رہے ایسے میں ان کا چہرہ ہمیشہ کی طرح بے تاثر لگ رہا تھا۔

"یہ تو اچھی بات ہے۔" بالآخر وہ بولے تو سب کی جان میں جان آئی اور نائمہ کا بجھا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔

"کس سبجیکٹ میں ماسٹرز کرنا چاہتی ہو بیٹا!؟" ابا جی اب براہ راست نائمہ سے پوچھ رہے تھے اور ان کے لہجے کی نرمی نائمہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔

"جی اردو لٹریچر میں۔" جواب دیتے ہوئے اگر اس کے لہجے میں جھجک تھی تو اس کی وجہ ابا جی سے شاذ و نادر ہی کبھی مخاطب ہونا ہی تھا۔ انہوں نے بچوں کو کبھی خود سے اتنا قریب ہونے کا موقع ہی نہیں دیا تھا کہ وہ اعتماد اور دوستی کی فضا میں انہیں کچھ کہہ سکتے۔

"ٹھیک ہے۔ ایڈمشن اوپن ہو جائیں تو میں فارم منگوا دوں گا۔" انہوں نے سادہ سی نرمی سے کہا اور اٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی نائمہ خوشی سے چیخ کر ماہ نور کے گلے لگ گئی تھی اور باقی سب مسکراتی نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

اس روز صبح ہی سے امی جان کی کمر میں درد تھا۔ ماہ نور نے نائمہ کو ساتھ لگا کر ناشتا تیار کیا اور امی جان کو میڈیسن کھلا کر کوئی بھی کام نہ کرنے کی تاکید کر کے ہاسپٹل چلی گئی۔

"میں جلدی واپس آ جاؤں گی اور دوپہر کا کھانا خود بنا لوں گی۔" گھر سے نکلتے ہوئے اس نے ایک بار پھر ان سے کہا تھا۔ امی جان نے اس کی یہ بات مان بھی لی تھی۔ مگر دوپہر کو جب وہ گھر پہنچی تو امی جان اسے کچن میں دکھائی دیں۔ وہ اندر جانے کی بجائے ان کے پاس چلی آئی۔

"امی جان! کیا کر رہی ہیں۔ میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ میں خود آ کر سارا کام کر لوں گی۔ آپ ہی کے آرام کی خاطر تو میں جلدی آئی ہوں۔ مگر آپ پھر بھی کاموں میں لگی ہوئی ہیں۔" اس نے کچھ خفگی سے کہا تھا۔ امی جان اس کا چہرہ دیکھ کر ہلکے سے مسکرا دیں۔

"میں کچھ نہیں کر رہی بیٹا! گاؤں سے خضر کی دادی جان اور چچی آئی ہیں۔ بس ان کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ ورنہ سارا وقت تو میں نے آرام ہی کیا ہے۔"

انہوں نے اسے تسلی دی تھی۔

"اچھا ابھی آپ اندر چل کر بیٹھیں چائے میں بنا لاتی ہوں۔" اس نے نرمی سے کہا اور ٹرے میں برتن سیٹ کرنے لگی۔

"ابھی تو تم تھکی ہوئی آئی ہو۔ چائے پی لو پھر کرتی رہنا کام۔"

"میں بالکل بھی نہیں تھکی امی جان! آپ بس اندر چل کر بیٹھیں۔" اس نے اصرار کیا تو امی جان کو اندر جانا ہی پڑا۔

کچھ دیر کے بعد وہ بڑے کمرے میں چائے لے کر گئی تو وہاں دادی جان اور چچی جان کے ساتھ ابا جی بھی موجود تھے اس نے سب کو مشترکہ سلام کیا اور دادی جان کے پاس بیٹھ گئی۔ دادی جان سے اس کی چند ایک بار فون پر ہی بات ہوئی تھی یا شادی کے دنوں میں اس نے انہیں دیکھا تھا۔ دادی جان بڑے لیے دیے سے انداز میں اس سے بات کیا کرتی تھیں۔ دراصل وہ بھی خضر کی شادی اپنی نواسی سے کرنے کی خواہاں تھیں مگر جب خضر کی منگنی اچانک ہی ماہ نور سے ہو گئی تو وہ کچھ بول نہیں سکیں۔ البتہ دل ہی دل میں انہیں ماہ نور سمیت سارے گھر پر غصہ تھا۔

"دادی جان! بہت دنوں کے بعد آپ آئیں۔" انہیں چائے دیتے ہوئے ماہ نور نے بڑے نرم اور دوستانہ انداز سے پوچھا تھا۔

"بس بیٹا! گھر سے نکلنا ہی نہیں ہوتا۔ سوچ تو کئی دنوں سے رہی تھی مگر بس آیا ہی نہیں گیا۔" اس کے بڑھائے گئے شامی کباب اور رول اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے سدا کی باتونی دادی جان بولنا شروع کر چکی تھیں اور ماہ نور باقی سب کو چائے دینے کے ساتھ ساتھ نہایت انہماک سے ان کی باتیں سن رہی تھی اور بیچ میں لقمے بھی دیے جا رہی تھی۔ چچی جان امی جان سے ادھر ادھر کی باتوں میں لگ چکی تھیں اور ابا جی دلچسپی سے ماہ نور اور دادی کی گفتگو سن رہے تھے۔ چند منٹ میں ہی انہیں یقین ہو چکا تھا کہ باقی سب کی طرف ماہ نور دادی جان سے بھی دوستی کر کے ہی چھوڑے گی۔

اور ان کا یہ یقین غلط ثابت نہیں ہوا۔ دادی جان دو دن کے بعد جب واپسی کے لیے روانہ ہوئیں تو ان کی زبان پر ماہ نور کی ہی تعریفیں تھیں اور شاید زندگی میں پہلی بار وہ نفیسہ بیگم سے بھی اچھی طرح پیش آ رہی تھیں۔ کیونکہ جہاں کہیں وہ ذرا بھی نفیسہ بیگم سے بے رخی سے پیش آتیں یا حسب عادت ان کی کوئی برائی بیان کرتیں تو ماہ نور بڑے پیار اور نرمی سے انہیں نا صرف ٹوک دیتی بلکہ امی جان کی صفائی اتنی اچھی طرح سے پیش کرتی کہ دادی جان کو قائل ہونا ہی پڑتا۔

"واقعی، بہت اچھی ڈھونڈی ہے نفیسہ نے۔ اتنا طریقہ سلیقہ آج کل ہر کسی میں کہاں نظر آتا ہے۔"

جاتے جاتے انہوں نے پروفیسر حسن سے مخاطب ہو کر کہا تو وہ حیران سے دادی جان سے مل کر کچن کی طرف جاتی ماہ نور کو دیکھ کر رہ گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں پہلی بار اپنی ماں کے منہ سے اپنی بیوی کی تعریف سنی تھی پہلی بار انہوں نے نفیسہ کا نام بغیر کسی طنز کے لیا تھا۔ جو مقام وہ اپنی بیوی کو نہیں دلا سکے تھے وہ ان کی بہو دلا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کے دس بج چکے تھے۔ خضر بیڈ پر دراز کوئی میگزین دیکھ رہا تھا اور ماہ نور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے بالوں میں برش کر رہی تھی۔ جب بے حد حواس باختہ سی امی جان کمرے میں داخل ہوئیں۔

"خضر! ناصر کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔" انہوں

www.pkdigest.com

نے اندر آتے ہی گھبرائے ہوئے انداز سے کہا۔ ماہ نور اور خضر دونوں بے ساختہ چونکے اور اپنی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں امی جان! آپ کو کس نے بتایا؟" خضر نے پریشانی سے سوال کیا۔

ابھی آدھا گھنٹہ پہلے ہی وہ اور ماہ نور امی جان کے پاس سے اٹھ کر آئے تھے۔ تب تک ناصر گھر نہیں آیا تھا۔ عام طور پر وہ گیارہ بارہ بجے ہی گھر لوٹا کرتا تھا۔ امی جان اور خضر اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکے تھے۔ مگر وہ اپنی روش چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ اسے ایف اے کیے کئی سال گزر چکے تھے مگر اس نے آگے ایڈمشن نہیں لیا تھا۔ ہر چند ماہ کے بعد وہ کوئی چھوٹی موٹی نوکری تلاش کرتا مگر ایک دو ماہ کے بعد ہی وہ نوکری اسے اپنے گلے کا پھندہ لگنے لگتی تھی اور وہ اسے چھوڑ دیتا تھا۔ واحد کام جو پچھلے کئی سالوں سے وہ مستقل مزاجی سے کر رہا تھا وہ آوارہ گردی تھا۔ اس کے کئی دوست تھے مگر سب کے سب وقت ضائع کرنے کے شوقین اور زندگی کو اپنی دانست میں ہنستے کھیلتے گزار دینے کے قائل تھے اور ناصر مکمل طور پر اپنے ان دوستوں کے رنگ میں رنگ چکا تھا۔

"ابھی ابھی اس کے کسی دوست کا فون آیا تھا۔ ناصر اور اس کے تین دوستوں کا کچھ لڑکوں سے جھگڑا ہو گیا اور نوبت ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ حتیٰ کہ ناصر ہی کے کسی دوست نے مخالف فریق کے ایک لڑکے کو گولی ماردی وہ لڑکا شدید زخمی ہوا ہے اور پولیس ناصر، اس کے دوستوں اور دوسرے لڑکوں کو پکڑ کر لے گئی ہے۔"

امی جان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ بات بھی بہت مشکل سے کر رہی تھیں۔ گھبراہٹ اور پریشانی کے مارے لفظ ان کی گرفت میں ہی نہیں آرہے تھے۔

"اوہ یہ تو بہت برا ہوا۔" جھگڑے کی تفصیل سن کر خضر کی پریشانی بڑھ گئی تھی۔

"وہ لڑکا بتا رہا تھا کہ ناصر نے خود جھگڑے میں حصہ نہیں لیا تھا۔ وہ تو بس اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ جھگڑا اتنا اچانک ہوا کہ ناصر کو وہاں سے نکل کر بھاگنے کا موقع نہیں ملا۔ پولیس موبائل گشت پر تھی اس لیے وہ لوگ بھی گولی کی آواز سنتے ہی وہاں پہنچ گئے۔ جس لڑکے نے فون کیا وہ بھی وہاں موجود تھا مگر جس دکان میں ناصر اور اس کے دوست بیٹھے ہوئے تھے وہ اس کے باہر کھڑا تھا اس لیے ناصر کے دوست کو پستول نکالتے دیکھ کر ہی وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ بتا رہا تھا کہ ناصر نے بھی بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر تب تک پولیس وہاں پہنچ چکی تھی۔"

"کتنا منع کیا تھا میں نے ناصر کو کہ سمیع وغیرہ اچھے لڑکے نہیں ہیں۔ وہ سمیع کی دکان پر نہ جا کے بیٹھا کرے۔ مگر اس نے میری ایک نہیں سنی اور وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔" کمرے میں ٹہلتے ہوئے خضر پریشانی سے بول رہا تھا۔

"خضر! کچھ کرو بیٹا! پولیس والے تو بہت بری طرح تشدد کرتے ہیں۔" امی جان اب رو رہی تھیں۔ ماہ نور نے بے اختیار ہی آگے بڑھ کر انہیں گلے سے لگا لیا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا امی جان! آپ پریشان نہ ہوں۔" خود اس کا دل بری طرح سے گھبرا رہا تھا مگر امی جان کو تسلی دے رہی تھی۔

"ابا جی کا ایک شاگرد ڈی ایس پی ہے۔ اگر ابا جی اس سے بات کرلیں تو ناصر آج رات ہی گھر آسکتا ہے۔ ورنہ پھر کل ضمانت کی کوشش کرنا ہوگی۔" خضر کو ٹہلتے ٹہلتے ابا جی کے شاگرد کا خیال آیا تو وہ رک کر کہنے لگا۔

"نہیں اسے رات بھر تھانے میں نہیں رہنا چاہیے اگر خاندان یا محلے والوں کو اس بات کی بھنک بھی پڑ گئی تو برسوں کی بنی بنائی عزت خاک میں مل جائے گی۔ جوان بیٹی ہے میری کون اسے بیاہنے آئے گا۔ لوگ ہمارے سارے گھر کو ناصر ہی کے نام سے منسوب کریں گے۔" امی جان نہ جانے کیا کیا سوچ چکی رہی تھیں اس لیے بلبلا ہی اٹھیں۔

"ٹھیک ہے پھر میں ابا جی سے بات کرتا ہوں۔" خضر نے سویٹر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تمہارے ابا جی پتا نہیں مانیں گے بھی یا نہیں۔" امی جان کی آواز اندیشوں سے لرز رہی تھی۔

"کیوں نہیں مانیں گے امی جان! کیا انہیں اپنی اولاد اور اپنی عزت پیاری نہیں ہے۔ وہ ضرور کچھ کریں گے۔ آپ پلیز یہاں بیٹھیں اور اللہ سے دعا کریں۔" ماہ نور نے نرمی سے انہیں دلاسا دیا اور بیڈ پر بٹھانے لگی۔ اس وقت حواس باختہ نائمہ اور خرم بھی وہیں چلے آئے۔

"بھابھی۔" لرزتی کانپتی نائمہ اس کے گلے لگ کر رو دی۔

"کچھ نہیں ہوتا بس اللہ سے دعا کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ماہ نور باری باری سب کو تسلیاں دے رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

امی جان اور خود خضر کے خدشات کے برعکس ابا جی نے خضر کے منہ سے پوری بات سن کر نہ تو کسی غصے کا اظہار کیا تھا اور نہ ہی ناصر کو برا بھلا کہا تھا۔ بس وہ گم سم سے ہو گئے تھے اور ان کے چہرے پر دکھ اور اذیت کے ساتھ کوئی اور عجیب سا تاثر بھی چھا گیا تھا جسے خضر کوئی نام نہیں دے سکا۔

جب خضر نے ان سے بات کی تو وہ اپنی بیٹھک میں ہی تھے۔ بعد میں بھی وہ اندر نہیں گئے۔ اپنے موبائل سے انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے شاگرد سے بات کی اور یہ ان کی زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ وہ اپنے کسی شاگرد سے کسی بھی کام کے لیے کہیں اور پھر کام بھی کیا جو اسے بتاتے ہوئے فون پر بات کرتے ہوئے بھی ان کا چہرہ خفت سے سرخ ہوا جا رہا تھا۔

اپنے اسٹوڈنٹ سے بات کرنے کے بعد وہ خود خضر کے ساتھ اس تھانے تک بھی گئے جس کی حوالات میں ناصر بند تھا اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ دونوں اسے لے کر اور روزنامچے میں لکھی گئی رپورٹ سے اس کا نام کٹوا کر جب اسے گھر واپس بھی لائے تب بھی ابا جی کچھ نہیں بولے تھے اور نہ گھر کے اندر آئے تھے۔ بلکہ دوبارہ بیٹھک میں چلے گئے تھے۔ حالانکہ اس وقت سے بھی خاصا پہلے وہ اندر آجایا کرتے تھے مگر اس روز وہ پوری رات نہ اندر آئے اور نہ ہی سوئے بلکہ بیٹھک میں کرسی پر بیٹھے نہ جانے کن سوچوں میں غلطاں رہے۔

صبح کی نماز کے بعد امی جان ان کو دیکھنے آئیں تو وہ اس وقت بھی کرسی پر ہی بیٹھے تھے اور یوں ساکت و صامت نظر آرہے تھے جیسے کوئی پتھر کا مجسمہ ہو۔ وہ چند لمحے تک وہاں کھڑی انہیں دیکھتی رہیں مگر جب وہ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تو خاموشی سے واپس پلٹ گئیں۔ وہ خود بھی اس پوزیشن میں نہیں تھیں کہ ابا جی سے کوئی بات کرسکتیں۔ کوئی ایسی بات جو ان کو دلاسا دے سکتی یا ان کی تقویت کا باعث بن سکتی۔ وہ خود بھی رات بھر جاگتی رہی تھیں۔ اور ناصر کے بارے میں سوچ سوچ کر روتی رہی تھیں۔ اس لیے اس وقت ان کا سر درد کی شدت سے پھٹ رہا تھا اور جسم بے جان سا ہو رہا تھا وہ اندر آئیں تو ماہ نور انہیں کچن میں دکھائی دی۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر انہیں تھوڑا سا حوصلہ ہوا۔ وہ اسی کے پاس چلی آئیں۔ وہ ناشتا بنانے کی تیاری کر رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"امی جان! آپ کے لیے چائے بنا دوں۔"

"ہاں بیٹا! بنا دو اور ایک پیالی اپنے ابا جی کو بھی دے آؤ بیٹھک میں بیٹھے ہیں اور رات بھر سوئے نہیں۔" آزردگی سے کہہ کر وہ اندر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

ماہ نور نے چائے بنائی اور پہلے ابا جی کو دینے چلی آئی۔ ابا جی ابھی بھی کرسی پر ہی بیٹھے تھے۔ اور نہ جانے کن سوچوں میں گم تھے۔ ماہ نور کو لگا کہ ایک رات میں ہی ابا جی بہت بوڑھے لگنے لگے ہیں۔ اسے دکھ ہونے لگا۔

"ابا جی! چائے لے لیں۔" وہ اس کی موجودگی محسوس کرنے کے باوجود اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے اس لیے اسے ان کو مخاطب کرنا پڑا۔ انہوں نے سرخ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے چائے کا کپ تھام لیا۔ ایک بار پھر وہ اس کی طرف سے توجہ ہٹا چکے تھے۔ ماہ نور چند لمحے وہاں خاموش

www.pkdigest.com

کھڑی اپنی انگلیاں مروڑتی رہی پھر کچھ سوچ کر نرمی سے بولی۔

"اباجی! میں آپ کے دکھ کو سمجھ سکتی ہوں۔ اور میں نہیں کہتی کہ آپ اس دکھ کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر بھول جائیں مگر میں آپ سے صرف ایک بات کہتی ہوں کہ اگر ہمارے جسم کا کوئی حصہ زخمی یا بیمار ہو جائے تو ہم اسے اپنے باقی جسم سے کاٹ کر نہیں پھینک دیتے بلکہ اس کا علاج کرنے کی اسے باقی جسم جیسا صحت مند بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اور اباجی اولاد بھی انسان کے اپنے وجود کا حصہ ہوتی ہے۔ اگر لائق فائق اور فرمانبردار بچے پر والدین فخر کر سکتے ہیں۔ تو کسی بھی لحاظ سے ناکام رہ جانے والے بچے کو انہیں اپنی زندگی سے الگ نہیں کر دینا چاہیے۔ بلکہ اس کی کامیابی کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ خواہ اس کے لیے انہیں کتنی ہی تکلیف سے کیوں نہ گزرنا پڑے۔

آپ ناصر سے جتنے بھی خفا ہوں مگر میری آپ سے التجا ہے کہ اس نازک موڑ پر اس سے رخ نہ موڑیے گا۔ ورنہ وہ کبھی بھی سنبھل نہیں سکے گا۔" نرم لہجہ پراثر الفاظ اور اس کا تمام تر خلوص، اباجی جیسے چونک سے گئے تھے۔ وہ اپنی بات ختم کر کے جا چکی تھی۔ مگر محض چند منٹ میں ان کی سوچ کا انداز بدل گیا تھا۔ انہوں نے دکھ کے دبیز بادلوں کو اپنے دل سے ہٹتا ہوا محسوس کیا اور چائے پیتے ہوئے صورت حال کا نئے سرے سے تجزیہ کرنے لگے مگر اس بار ان کی سوچ کا رخ اس رخ سے بہت مختلف تھا۔ جو انہیں رات بھر اپنی سمت متوجہ رکھ چکا تھا۔ اب وہ ناصر کے لیے سوچ رہے تھے۔ اس سے پہلے کا تمام وقت انہوں نے اپنے لیے سوچا تھا۔ اپنے دکھ پر پریشان ہوتے رہے تھے مگر اب وہ اپنے بیٹے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

"ناصر! تم چائے پیو گے۔" وہ امی جان کو چائے دینے گئی تو ناصر وہیں بیٹھا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور اس کا چہرہ دیکھ کر صاف لگ رہا تھا کہ وہ افسردہ اور شرمندہ ہے۔ وہ آہستہ آہستہ امی جان سے کچھ کہہ رہا تھا اور امی جان یوں خاموش اور لاتعلق نظر آ رہی تھیں جیسے اس کی بات سن ہی نہ رہی ہوں۔ ماہ نور کو اندر آتا دیکھ کر ناصر بھی چپ ہو گیا۔

"نہیں بھابھی جی نہیں چاہ رہا۔" اس نے بجھے ہوئے انداز سے جواب دیا اور اٹھ کر باہر چلا گیا ماہ نور بھی امی جان کو چائے دے کر واپس کچن میں چلی گئی اور ناشتا تیار کرنے لگی۔ پراٹھے پکانے کے بعد وہ آملیٹ بنا رہی تھی جب ناصر کچن میں آیا اور کہنے لگا۔

"بھابھی! مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔"

"ہاں ہاں کہو۔" وہ اپنے مخصوص دوستانہ انداز سے پوری توجہ سے ناصر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"آپ امی جان سے کہیں مجھے ملک سے باہر جانے دیں میں یہاں رہا تو شاید کبھی بھی سنبھل نہ سکوں۔"

"تم سنبھلنا چاہتے ہو؟" ماہ نور نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر سوال کیا تھا۔

"جی۔" وہ مدھم آواز میں بولا۔ "اور شاید کوئی بھی اب میرا یقین نہیں کرے گا لیکن میں نے کئی بار کوشش کی ہے مگر میرے [illegible] دوست مسئلہ بن جاتے ہیں وہ میری کوشش کو ناکام بنا دیتے ہیں اور میں کچھ ہی دنوں میں پھر وہی سب کرنے لگتا ہوں جسے میں چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا ہوتا ہوں۔ اگر میں یہاں رہا تو شاید پھر ایسا ہی ہو گا۔ لیکن اگر میں یہاں سے کہیں دور چلا جاؤں تو مجھے یقین ہے کہ میں سنبھل جاؤں گا اور وہ سب کچھ کرنا چھوڑ دوں گا جو امی جان اور باقی سب کو ناپسند ہے۔ لیکن ابھی شاید انہیں اس پر بھی یقین نہیں آئے گا۔" وہ بجھے ہوئے انداز میں بول رہا تھا ماہ نور کو اس پر ترس آنے لگا۔

"کوئی یقین کرے یا نہ کرے مگر مجھے یقین ہے کہ تم ضرور سنبھل جاؤ گے۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔ امی جان اور اباجی کو منانا میرا کام ہے۔ اور میں ان شاء اللہ ہر صورت یہ کام کروں گی۔" وہ پورے اعتماد سے بولی تھی۔ اس کے انداز اور الفاظ نے جادو کا سا اثر کیا تھا

ناصر کا بجھا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔

"اور وہ مجھے معاف بھی کر دیں گے نا۔" وہ بچوں جیسی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔ ماہ نور بے اختیار مسکرا دی۔

"بالکل کر دیں گے۔ بس تم یہ کرو کہ جتنا عرصہ بھی پاکستان میں ہو۔ زیادہ سے زیادہ وقت گھر پر گزارو سب کو توجہ دو۔ پھر دیکھنا سب تم پر اعتماد کریں گے اب چلو ڈائننگ ٹیبل پر میں ناشتا لے کر آ رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے بھابھی۔" وہ ممنونیت سے بولا اور باہر جانے لگا۔

"ناصر!" ماہ نور نے پیچھے سے پکارا تھا۔

"جی۔" ناصر نے پلٹ کر دیکھا۔

"ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تمہیں ٹوٹنے نہیں دیں گے۔" اس نے پورے خلوص سے کہا تھا اور اس کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا۔ جس نے اس وقت ڈائننگ ٹیبل پر آ کر بیٹھے اباجی، امی جان اور خضر کو چونکا سا دیا تھا اور کچن سے نکلتے ناصر کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو بھر دیے تھے۔

"اگر ماہ نور بھابھی ہو کر ناصر کے لیے ایسا سوچ سکتی ہے تو ہماری تو وہ اولاد ہے نفیسہ۔ ہم اسے اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔"

اباجی نے بہت عزم سے کہا تھا۔ اسی وقت ناصر وہاں پہنچا تھا۔ اباجی کے الفاظ نے اس کے چہرے پر چمک پیدا کر دی اور باقی سب کے دل بھی مطمئن سے ہونے لگے۔ دکھ کے بادل ایکدم ہی چھٹ سے گئے تھے۔ خضر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے ناصر کو گلے سے لگا لیا۔

☆ ☆ ☆

"امی جان کی کمر میں آج پھر درد ہو رہا ہے اباجی! میرا خیال ہے انہیں کسی اچھے فزیو تھراپسٹ کو دکھانا چاہیے۔" ماہ نور شام کی چائے اباجی کو دینے ان کی بیٹھک میں آئی تھی اور کافی فکرمندی سے کہہ رہی تھی۔ اباجی نے اپنی پڑھنے والی عینک اتار کر میز پر رکھی اور اس کی طرف دیکھنے لگے جو شکل پر بارہ بجائے کھڑی تھی۔ اسے اس گھر میں آئے ایک سال ہونے کو آیا تھا اور وہ پہلے دن سے اس کا یہی انداز دیکھ رہے تھے۔ گھر کے کسی بھی فرد کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ یوں ہلکان ہو جایا کرتی تھی کہ جیسے یہ اس کا ذاتی مسئلہ ہے۔ نائمہ کی پڑھائی، امی جان کے درد، اباجی کا الگ تھلگ رہنا، ناصر کو ملک سے باہر بھجوانا ان سب مسائل کو وہ ایسے ہی حل کرتی آئی تھی جیسے یہ اس کے ذاتی مسائل ہوں۔ بعض اوقات اباجی کو اس پر رشک آیا کرتا تھا کہ وہ کس قدر بے غرضی سے سب کے لیے سوچتی اور عمل کرتی ہے۔ اس وقت بھی اسے یوں اپنی ساس کے لیے فکرمند ہوتا دیکھ کر انہیں اس پر پیار آیا تھا۔

"ایک بات بتاؤ ماہ نور! تم سب کی اتنی فکر کیوں کرتی ہو۔ کیا خضر نے تمہیں ایسا کرنے کو کہا ہے۔"

وہ نہ جانے کس خیال کے تحت اس سے پوچھ رہے تھے ان کا سوال بالکل اچانک بھی تھا اور موجودہ موضوع سے مطابقت بھی نہیں رکھتا تھا مگر وہ نہ چونکی نہ حیران ہوئی بلکہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"شروع شروع میں تو میں واقعی سب کے دل جیتنا چاہتی تھی۔ اس لیے سب کا خیال رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر اب ایسا نہیں ہے۔ اب میں سچ مچ سب سے محبت کرتی ہوں اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں سب کا خیال رکھوں۔ خضر سے میری اس بارے میں کبھی براہ راست بات نہیں ہوئی مگر میں اتنا جانتی ہوں کہ انہیں میرا گھر کے افراد کے ساتھ گھل مل کر رہنا پسند ہے۔ اور اس چیز سے انہیں سکون محسوس ہوتا ہے۔"

"تمہیں یوں ہر کسی سے محبت کرتے ہوئے ڈر نہیں لگتا۔" وہ نہ جانے کہاں پہنچے ہوئے تھے۔

"ڈر؟" ماہ نور اب کی بار تھوڑا سا حیران ہوئی تھی "کسی سے محبت کرتے ہوئے بھلا ڈر کیوں لگے گا۔ محبت تو دل کو خوشی دیتی ہے۔ ڈراتی تھوڑا ہی ہے۔"

"لیکن دل کو سب سے زیادہ دکھ بھی تو یہ محبت ہی

www.pkdigest.com

دیتی ہے اگر دور ہو جائے، بچھڑ جائے تو محبت انسان کو توڑ بھی تو ڈالتی ہے۔ ہم جن لوگوں سے محبت کرتے ہیں۔ وہ لوگ ہماری کمزوری بن جاتے ہیں۔ اور اگر کسی وجہ سے وہ لوگ ہم سے دور چلے جائیں تو زندگی کے رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ سب کچھ اجنبی سا لگنے لگتا ہے۔ اپنا وجود ادھورا محسوس ہوتا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس سے بڑی تکلیف اور کوئی نہیں ہوتی اس تکلیف کو سہنا بہت مشکل کام ہے۔"

انہوں نے جھرجھری سی لی تھی۔ ماہ نور نے غور سے ان کا چہرہ دیکھا جس پر دکھ کے سائے پھیلے ہوئے تھے اور ان کی آنکھیں یکدم ہی ویران سی ہو گئی تھیں۔

"لیکن ابا جی! ہم صرف اس ڈر سے اپنے سے وابستہ لوگوں سے محبت کرنا چھوڑ تو نہیں سکتے کہ کہیں وہ ہم سے دور نہ چلے جائیں۔ ہم سے بچھڑ نہ جائیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو بھی خوش نہیں رہ سکیں گے اور نہ خود سے وابستہ لوگوں کو خوش رکھ سکیں گے۔ اس طرح تو زندگی کا سارا حسن ہی ختم ہو جائے گا۔"

وہ بہت نرمی سے بولی تھی۔ اس کا لہجہ عام مگر اس کی کہی ہوئی بات بہت خاص تھی۔ پروفیسر حسن گم سم سے ہو کر رہ گئے۔ اس بار انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ ماہ نور نے ان کے خاموش وجود کو دیکھا اور نہ جانے کیا سوچ کر چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئی۔ پروفیسر حسن اس کے جانے کے بعد بھی گم سم سے ہی بیٹھے رہے۔ ان کے سامنے پڑی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی مگر ان کا دھیان چائے کی طرف بالکل بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی ذات کے سفر پر روانہ ہو چکے تھے اور اتنی دور نکل گئے تھے کہ ان کے اردگرد کے مناظر سامنے ہوتے ہوئے بھی ان کی نظروں کی گرفت میں نہیں رہے تھے۔

"کیا واقعی میں غلط ہوں۔ کیا یہ سب کچھ اس سے مختلف بھی ہو سکتا تھا؟" وہ زندگی میں پہلی بار اپنے آپ سے یہ سوال پوچھ رہے تھے اور اندر سے آنے والے جواب انہیں حیران کر رہے تھے پریشان کر رہے تھے۔ انہیں ان جوابات پر یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

"تو کیا میں عمر بھر ناحق ہی ڈرتا رہا ہوں۔ ناحق ہی میں نے خود کو بھی اذیت میں رکھا اور دوسروں کو بھی۔" نہ جانے کیا کچھ یاد آیا تھا کہ زندگی میں پہلی بار انہیں احساس جرم ہو رہا تھا۔

"لیکن وہ سب کچھ جو قسمت نے میرے ساتھ کیا۔ وہ سب کچھ سہہ لینے کے بعد میں پہلے جیسا کیسے بن سکتا تھا۔" ان کے دل نے دبا دبا سا احتجاج کر کے اپنی صفائی دینا چاہی تھی۔ جس دل میں محبت ایک بار بسیرا کر لے وہ پھر محبت سے کبھی خالی نہیں ہوتا محبت بار بار لٹانے سے کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی ہے۔ مضبوط ہوتی ہے اور مضبوط کرتی ہے ان لوگوں کو جو سب سے محبت کرتے ہیں۔

ایک دوسری آواز انہیں بے چین سا کر گئی۔ انہوں نے نڈھال ہو کر اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

☼ ☼ ☼

"حسن اٹھ جاؤ بیٹا دھوپ سر تک آ پہنچی ہے۔" گہری نیند میں تھا جب ماں جی نے اسے بازو سے جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کی نیند ایسی ہی گہری ہوا کرتی تھی کہ سرہانے کوئی کھڑا ڈھول بھی بجا رہا ہے تو اسے پتا نہ چلے اس وقت بھی صحن کے جس حصے میں وہ سو رہا تھا وہاں اگرچہ نیم کے درخت کا سایہ تھا مگر اس سائے کے علاوہ سارا صحن گرمیوں کی تیز اور تیکھی دھوپ سے بھر چکا تھا مگر اس تپش کے باوجود وہ یوں سکون سے سویا ہوا تھا جیسے تاروں کی چھاؤں میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اسے لوریاں سنا رہے ہوں اور ماں جی کو اس کی یہی بات بری لگتی تھی ورنہ وہ ہر لحاظ سے ان کے باقی بچوں سے کہیں اچھا تھا۔ پڑھائی بہت محنت سے کرتا تھا۔ ہر کسی کا خیال رکھتا تھا اور کبھی کسی سے اونچی آواز سے نہیں بولتا تھا۔

"کتنی بار کہا ہے رات کو دیر تک نہ جاگا کرو مگر اس

لڑکے پر اثر ہی نہیں ہوتا۔ رات کو جب باہر موسم اچھا ہوتا ہے تو اندر کمرے میں گھسا رہتا ہے اور اب جب باہر سورج آگ برسا رہا ہے تو پڑا سو رہا ہے۔"

وہ اگر ڈھٹائی سے گرمی میں پڑا سو رہا تھا تو ماں جی بھی ہمت ہارنے اور وہاں سے چلے جانے کو تیار نہیں تھیں اور مسلسل بولنے کے ساتھ ساتھ وقفے وقفے سے اسے جھنجھوڑے بھی جا رہی تھیں بالآخر حسن کو ہی ہار ماننی پڑی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اب اندر جا کر سو مت جانا میں تمہارا ناشتا بنانے جا رہی ہوں۔"

وہ سلیپر پہن کر بیٹھک کی طرف چلا تو ماں جی نے پیچھے سے پکار کر کہا حسن نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا تھا مگر بیٹھک میں پہنچتے ہی وہاں موجود اکلوتے پلنگ پر لیٹا اور اگلے ہی پل دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد جب اس کی چھوٹی بہن ماں جی کے کہنے پر اسے ناشتے کے لیے بلانے آئی تو وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اس لیے اس نے الٹے قدموں واپس جا کر ماں جی کو بتا دیا کیونکہ حسن کو نیند سے جگانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

"اس لڑکے کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے کہا بھی تھا کہ ناشتا بنانے جا رہی ہوں پھر بھی اندر جا کر سو گیا اب اٹھے گا بارہ بجے اور پھر اٹھتے ہی مانگے گا کہ دن کا آغاز تو جب بھی ہو پراٹھوں سے ہی ہو گا۔" اس کے دوبارہ سو جانے کا سن کر ماں جی کو خوب غصہ آیا تھا۔ اس لیے وہ مسلسل بڑبڑائے جا رہی تھیں۔

"کیا ہوا خالہ! کس پر غصہ ہو رہی ہیں۔" اس وقت وہاں فرح کی انٹری ہوئی تھی۔ وہ حسن کی چچا زاد بھی تھی اور خالہ زاد بھی اور سبھی کی لاڈلی تھی۔ جبھی کہ اسے دیکھ کر ماں جی کا خراب موڈ بھی پل بھر میں ٹھیک ہو گیا۔

"غصہ کیا ہونا بیٹی! یہ حسن کی بات کر رہی تھی۔ اسے بتا کر آئی تھی کہ ناشتا بنانے جا رہی ہوں مگر پھر بھی اندر جا کر دوبارہ سو گیا۔"

ان کے لہجے میں چند لمحے پہلے والا غصہ بالکل ہی مفقود ہو چکا تھا اور اس کی جگہ اب نرمی اور حلاوت نے لے لی تھی۔ فرح سے انہیں بہت محبت تھی۔ ایک تو چھوٹی بہن کی اکلوتی نشانی تھی اور وہ ہو بہو اپنی ماں کا عکس تھی جو کچھ سال پہلے مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئی تھیں۔ اور ماں جی کو بہت عزیز تھیں۔ پھر خود فرح اتنی پیاری عادتوں کی مالک تھی کہ سب کو اپنے دل میں اس کے لیے بس پیار ہی کا جذبہ محسوس ہوتا تھا۔

"حسن آیا ہوا ہے لاہور سے؟ کب آیا؟" فرح کا دل خوشگوار انداز میں دھڑک اٹھا۔ حسن اس کے بچپن کا ساتھی اور اب دل کا مکین تھا۔ دو دن سے وہ ماموں کی طرف گئی ہوئی تھی ورنہ حسن کے آنے کی خبر سب سے پہلے اس کو ہوا کرتی تھی۔ حسن اپنے گھر میں قدم بعد میں رکھتا تھا پہلے فرح سے مل کر آتا تھا۔ کیونکہ جب تک وہ اسے دیکھ نہیں لیتا تھا۔ بقول اس کے اس کی تھکن نہیں اترا کرتی تھی۔

"کل شام کو آیا تھا۔ رات دیر تک دوستوں میں بیٹھا رہا اور اب اٹھ ہی نہیں رہا۔"

"لیجیے، نہیں اٹھ رہا میں ابھی اٹھاتی ہوں اسے۔" فرح نے ہنس کر کہا اور ناشتے کی ٹرے اٹھا کر بیٹھک میں چلی آئی حسن تکیے میں منہ دیے سو رہا تھا۔ فرح نے مسکرا کر بڑی محبت سے اسے دیکھا پھر ناشتے کی ٹرے ٹیبل پر رکھ کر ایک گلاس میں تھوڑا سا پانی ڈالا اور بلا تکلف حسن کے اوپر انڈیل دیا۔ حسن ہڑبڑا کر اٹھا۔ تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تم۔" حسن اپنی ساری کوفت بھول کر اس کی ہنسی میں کھو گیا۔ فرح کا گلابی چہرہ ہنسنے سے سرخ ہو گیا تھا اور شفاف براؤن آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی ذرا سا ہنستی تو اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگتا۔ لیکن جب کسی بات پر دکھی ہوتی تو پانی جیسے اس کی آنکھوں کا رستہ بھول جایا کرتا تھا اور وہ پتھر کی مورت نظر آنے لگتی تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" حسن کو مبہوت دیکھ کر وہ تھوڑا سا جھینپی تھی۔

"تمہیں دیکھ رہا ہوں، کہاں گئی تھیں تم؟" حسن

www.pkdigest.com

نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا۔

"تمہیں اچھی طرح پتا ہے کہ میں یہاں آکر سب سے پہلے تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں پھر بھی تم جب دیکھو سیر سپاٹے پر نکلی ہوئی ہو۔"

"اچھاجی! تو تم کون سا بتا کر آئے ہو۔ مجھے تمہارے آنے کا پتا ہوتا تو میں ماموں کے گھر کیوں جاتی؟" وہ حسن کی اپنے لیے محبت دیکھ کر اترائی تھی۔

"بس تم کہیں نہ جایا کرو۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔" بستر سے نیچے اترتے ہوئے اس نے دو ٹوک انداز سے کہا۔

"تمہیں تو پتا نہیں کیا کیا اچھا نہیں لگتا۔" فرح نے منہ چڑایا اور کمرے سے باہر جانے لگی۔ حسن لپک کر اس کے قریب آیا اور اس نے فرح کی کلائی پکڑلی۔

"مجھے صرف ایک چیز اچھی نہیں لگتی۔" اس کے بہت نزدیک کھڑا وہ بہت دھیان سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے زور دے کر بولا تھا۔

"کہ تمہیں میرے علاوہ کوئی اور دیکھے کوئی بھی۔" فرح کی پلکیں جھک گئیں۔ وہ اچھی طرح سے جانتی تھی کہ حسن اس کے لیے بہت جنونی ہے اور ماموں کا بڑا بیٹا یاسر کئی بار فرح کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوششیں کرچکا تھا۔ حسن اس بات سے واقف تھا اس لیے بھی اسے فرح کا ماموں کے گھر جانا پسند نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے آئندہ نہیں جاؤں گی۔ اب چلو ناشتا کر لو۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ حسن کے چہرے پر اطمینان سا چھا گیا اس نے آہستگی سے فرح کی کلائی چھوڑی اور منہ ہاتھ دھونے کے لیے کمرے سے باہر چلا گیا فرح چند لمحے وہاں کھڑی مسکراتے ہوئے اپنی سرخ ہو جانے والی کلائی کو سہلاتی رہی پھر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"اے سنو! کیا کر رہے ہو؟" شام کو وہ چھت پر بیٹھا جنرل نالج کی کتاب پڑھ رہا تھا جب فرح نے اپنی چھت کی منڈیر سے جھانک کر پوچھا۔

"نظر نہیں آرہا پڑھ رہا ہوں۔" اس نے چڑانے والے انداز سے کہا تھا اور ہمیشہ کی نازک مزاج فرح فوراً ہی چڑ بھی گئی۔

"جب دیکھو کچھ نہ کچھ پڑھتے ہی رہتے ہو۔ کبھی کچھ اور کرنے کا بھی سوچ لیا کرو۔" فرح نے اپنی طرف سے بہت تاک کر طعنہ مارا تھا حسن نے مسکرا کر کتاب بند کی اور بڑی دلچسپی اور انہماک سے فرح کی طرف دیکھنے لگا جو ہلکے سبز لان کے پرنٹڈ سوٹ میں بڑی کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ ڈھلتے سورج کی مدھم مدھم روشنی نے اس کے چہرے پر بڑی خوب صورت سی چمک بکھیر دی تھی۔

"اچھا کیا سوچا کروں تم بتا دو؟"

"مجھے نہیں پتا۔" وہ اس کے انہماک سے چڑ کر بولی تھی۔

"جب پتا نہیں تو پھر طعنے دینے کا کیا مطلب۔" وہ دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ہاں سارا کچھ تو تمہیں ہی پتا ہے نا [illegible] کالج میں [illegible] کوئی [illegible] سمجھنے لگے ہو۔" وہ بڑبڑانے لگی۔ حسن ہنس پڑا۔

"سی ایس ایس کر رہا ہوں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مگر تمہیں کیا پتا تم ٹھہریں نری جاہل کی جاہل۔"

"اچھا میں جاہل ہوں؟" وہ روہانسی ہو گئی۔ "ٹھیک ہے میں بھی اس سال یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لوں گی۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔" حسن نے فوراً ٹوکا۔ "میں اپنی شادی کو دو سال تک لٹکانے کے موڈ میں نہیں ہوں اس لیے آرام سے گھر بیٹھو۔"

"ہاں تاکہ تم ساری عمر مجھے جہالت کے طعنے مارو۔ بس میں نے کہہ دیا میں بابا سے آج بات کر رہی ہوں مجھے آگے ایڈمیشن لینا ہی لینا ہے۔" وہ اب ضدی لہجے میں بول رہی تھی مگر حسن نے کوئی اثر نہیں لیا۔ بلکہ

سابقہ اطمینان سے بولا۔

"ضرور لے لینا مگر شادی کے بعد میں خود تمہیں پڑھایا کروں گا۔"

"مجھے تمہارا احسان نہیں چاہیے۔" وہ تنک کر بولی۔

"تو ٹھیک ہے مت پڑھنا رہنا گنوار کی گنوار۔" حسن نے شانے اچکائے۔

"تم..." فرح نے دانت پیسے "بس میں ابھی بابا سے بات کرنے جا رہی ہوں۔" اس نے دھمکی آمیز انداز سے کہا اور منڈیر کے پیچھے غائب ہو گئی حسن مسکراتے ہوئے دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ فرح بابا سے یہ بات ہرگز نہیں کرے گی وہ خود اس سے جتنا مرضی لڑ لیتی مگر اس کے خلاف کبھی نہیں جا سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کو وہ بابا سے ملنے کے لیے گیا تو جاتے ہوئے فرح کے لیے لاہور سے لایا ہوا خوب صورت سا گلابی سوٹ اور ہم رنگ چوڑیاں بھی لے گیا۔ وہ گھر میں داخل ہوا تو کشادہ صحن پر سناٹا چھایا ہوا تھا جو کہ وہاں اکثر ہی چھایا رہتا تھا۔ کیونکہ گھر میں فرح کے علاوہ بس بابا ہی تھے۔ جو لڑکوں کے ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے اور دن کا بیشتر حصہ وہ گھر سے باہر رہا کرتے تھے اور جو وقت وہ گھر پر بھی ہوتے اس میں بھی یا تو ان کے پاس کوئی نہ کوئی آیا رہتا یا وہ کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے۔ اس لیے فرح کا بیشتر وقت ان کے گھر ہی گزرا کرتا تھا۔

وہ صحن میں داخل ہوا ہی تھا جب فرح کچن سے باہر نکل کر آئی ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ جیسے ہی وہ ان کے گھر جاتا فرح کو نہ جانے کیسے اس کی آمد کی خبر ہو جایا کرتی تھی اور وہ اس کے استقبال کے لیے صحن میں نکل آتی تھی۔ بعض اوقات وہ اس بات پر حیرت کا اظہار کرتا تو فرح ہنس کر کہتی۔

"سارا وقت میرے کان تمہاری آہٹوں پر ہی تو لگے رہتے ہیں۔ اس لیے جیسے ہی تم ہمارے گھر میں داخل ہوتے ہو مجھے فوراً پتا چل جاتا ہے۔"

اس وقت بھی وہ اگرچہ شام والی گفتگو کے بعد اس سے خفا تھی مگر پھر بھی ہمیشہ کی طرح صحن میں نکل آئی تھی۔ اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر حسن محبت سے مسکرا دیا۔ وہ ایسی ہی تھی کبھی تو بڑی سے بڑی بات کو ہنس کر پی جاتی اور کبھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بچوں کی طرح منہ پھلا لیا کرتی تھی۔

"اس طرح کی شکل نہ بنایا کرو بالکل ہی بندریا لگتی ہو۔" اس کے قریب رکتے ہوئے حسن نے چھیڑا۔

"اپنی شکل دیکھی ہے تم نے بھی لنگور کہیں کے۔"

ترکی بہ ترکی جواب دے کر اس نے حسن کے ہاتھ سے سوٹ والا شاپر جھپٹ لیا۔ یہ بات تو طے تھی کہ حسن ان کے یہاں آتے ہوئے جو کچھ بھی لاتا وہ صرف اس کے لیے ہوتا تھا۔ اور وہ کبھی خالی ہاتھ وہاں نہیں گیا کرتا تھا۔ خواہ ایک چاکلیٹ ہی کیوں نہ لے کر آئے۔

"تمہاری حرکتیں بھی بندروں والی ہیں۔ کیسے جھپٹ مارتی ہو۔" بابا کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ پھر بولا تھا مگر اس بار فرح نے کوئی جواب نہیں دیا وہ بے حد خوشی سے اپنا سوٹ اور چوڑیاں کھول کر دیکھ رہی تھی اور ہمیشہ کی طرح اس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہوا جا رہا تھا۔ حسن کی لائی ہوئی ہر چیز کو وہ متاع حیات کی طرح سنبھال سنبھال کر رکھا کرتی تھی۔ حسن محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوا بابا کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

بابا حسب معمول ایک کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ وہ ہمیشہ کرسی پر بیٹھ کر کتابیں پڑھا کرتے تھے خواہ کتنی ہی دیر تک مطالعہ کیوں نہ کریں حسن نے کبھی انہیں بستر پر بیٹھ کر یا لیٹ کر کتاب پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ان کے خاندان میں بابا ہی تھے جنہوں نے اعلا تعلیم حاصل کی تھی۔ خود حسن کے والد نے میٹرک کے بعد پڑھائی کو خیرباد کہہ دیا تھا اور باقی سب کا بھی ایسا ہی حال تھا۔ مگر بابا کو شروع ہی سے

www.pkdigest.com

حسن نے بھی چرالیا تھا۔ وہ شروع ہی سے بابا کے بہت قریب رہا تھا۔ اور شاید اسی قربت کی وجہ سے اسے کتابوں سے ان جیسی محبت ہو گئی تھی۔ بابا ہی کی خواہش پر وہ ایم اے انگلش کے بعد لیکچرار شپ مل جانے کے باوجود اب سی ایس ایس کر رہا تھا۔

"ارے میرا بیٹا آیا ہے۔"

اسے آتا دیکھ کر بابا ہمیشہ کی طرح خوش ہوئے تھے انہوں نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا اور ہمیشہ کی طرح بہت محبت سے اسے گلے لگا کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

"کیسے ہیں بابا! آپ۔" وہ ان کا ہاتھ تھام کر برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"بالکل ٹھیک اور تم سناؤ پیپرز کیسے ہوئے؟"

"بہت اچھے ہو گئے بابا! آپ کی دعائیں جو میرے ساتھ تھیں۔" وہ سی ایس ایس کا ایگزیم دے کر آیا تھا۔ جو کہ اس کی توقع سے بڑھ کر اچھا ہوا تھا۔

"گڈ اور انٹرویو کی تیاری شروع کردی۔"

"جی بابا! آخری پیپر دینے کے اگلے روز سے ہی شروع کردی تھی۔" وہ پر جوش انداز سے انہیں اپنے انٹرویو کی تیاری کی تفصیل بتانے لگا۔ فرح چائے لے کر آئی تو حسن اور بابا پوری طرح اپنے پسندیدہ موضوع 'کتابوں' میں غرق تھے اس نے ٹیبل پر چائے رکھی اور بڑی تمیز سے باہر جانے کے لیے مڑ گئی کیونکہ بابا کی اکلوتی بیٹی ہونے کے باوجود وہ اپنے کورس کی کتابوں کے علاوہ باقی ہر کتاب کو ہاتھ لگانا جرم خیال کرتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تو تم واپس جا رہے ہو؟" وہ بڑے انہماک کے ساتھ اپنے کپڑے بیگ میں رکھ رہا تھا جب پیچھے سے فرح کی آواز آئی اس نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا وہ بے حد افسردہ اور اداس لگ رہی تھی۔ حسن کو اتنے سال ہو گئے لاہور رہ کر پڑھتے ہوئے مگر فرح اب تک اس کی جدائی کی عادی نہیں ہو پائی تھی۔ ہر بار اس کے جانے کا سن کر وہ یونہی افسردہ ہو جایا کرتی تھی اور اس بار

پورے دو ماہ گاؤں میں گزار کر جا رہا تھا اور ادھر سے ان کی شادی کی تیاریاں بھی شروع ہو چکی تھیں۔ ماں جی کا اصرار تھا کہ اس سال وہ ہر صورت حسن کی شادی کریں گی۔ جلدی تو بابا کو بھی تھی مگر پھر بھی وہ چاہتے تھے کہ حسن سی ایس ایس کلیئر کرلے تو پھر ہی اس کی شادی کی جائے تاکہ اس کا دھیان نہ بٹے خود حسن کی بھی یہی خواہش تھی مگر ماں جی کے سامنے ان کی ایک نہیں چلی تھی اور یہ طے ہو گیا تھا کہ اس بار عید الفطر کے فوراً بعد حسن اور فرح کی شادی کردی جائے گی۔ اس سلسلے میں ماں جی نے تو تیاریاں بھی شروع کردی تھیں۔ فرح بے حد خوش تھی۔ اس کے روپہلے خواب حقیقت کا روپ دھارنے جا رہے تھے۔ ان دنوں اس کا ہر لمحہ خوشیوں کے ہنڈولے پر بسر ہو رہا تھا۔ سرخوشی اور اطمینان نے اس کے حسن میں بھی کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت کھلکھلاتی ہوئی نظر آتی تھی اور ایسے میں جب اسے حسن کے جانے کی خبر ملی تو وہ ہمیشہ سے زیادہ افسردہ ہو گئی۔

"جانا تو ہے ہی۔ چھٹیاں بھی ختم ہو رہی ہیں۔ اور رزلٹ بھی آنے والا ہے۔ لیکن تم پریشان نہ ہو۔ میں ان شاء اللہ جلدی آجاؤں گا۔" اس کے قریب رکتے ہوئے وہ بہت نرمی سے اسے دلاسا دے رہا تھا۔ مگر اس کی نرمی نے فرح پر الٹا اثر کیا اور اس کی جھیل سی گہری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"پگلی!" حسن نے محبت سے اس کی آنکھوں سے ٹوٹے موتی اپنی ہتھیلی پر چنے تھے۔

"اس طرح مت رویا کرو جانتی ہو نا کہ تمہارا رونا مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔" اس کے آنسوؤں سے وہ ہمیشہ کی طرح بے چین ہوا تھا۔ فرح نے جلدی سے دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں اور چہرے پر زبردستی مسکراہٹ لاکر بولی۔

"جلدی آنا اور وہاں اپنا بہت خیال رکھنا۔"

"ٹھیک ہے تم بھی اپنا خیال رکھنا اور بالکل اداس مت ہونا۔ اب تو جدائی کے دن بہت تھوڑے رہ گئے

ہیں میں بہت جلد اپنی جان کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور پھر کبھی خود سے دور نہیں کروں گا۔" وہ بہت جذب اور محبت کے عالم میں بولا تھا۔ فرح شرما کر باہر بھاگ گئی اور وہ مسکراتے ہوئے دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اور گنگناتے ہوئے پھر سے پیکنگ کرنے لگا۔ اس کے تصور میں فرح کا معصوم اور حسین چہرہ تھا۔ اور آنکھیں انوکھی خوشی سے چمک رہی تھیں۔ اس لمحے تقدیر نے تیکھی نظر اس کے روشن چہرے اور خوشی بھرے دل پر ڈالی تھی اور ناز سے مسکرادی تھی۔

☆ ☆ ☆

حسن نے سی ایس ایس کا تحریری امتحان پاس کرلیا تھا اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ان دنوں اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ قسمت کی دیوی اس پر پوری طرح سے مہربان ہو چکی ہے۔ اس روز بازار جا کر سب گھر والوں کے لیے تحائف خریدے اور اپنے کالج سے دو روز کی چھٹی بھی لے لی۔ تاکہ گاؤں جا کر سب کو یہ خوشخبری سنا سکے۔ شام کو اس نے ساری پیکنگ کرلی تھی مگر اگلی صبح اسے گاؤں جانا نصیب نہ ہوا اور وہ خوشیوں بھری شام بھی شاید آخری بار ہی اس کے حصے میں آئی تھی۔

اپنی پیکنگ ختم کرلینے کے بعد اس نے مٹھائی خریدی اور پروفیسر اکرام کے گھر چلا آیا۔ پروفیسر اکرام انگلش پڑھاتے تھے اور حسن اپنے کالج کے دنوں سے ہی ان سے متاثر تھا۔ اس کی لیاقت اور شوق دیکھتے ہوئے وہ ہمیشہ ہی اس پر خصوصی توجہ دیتے رہے تھے۔ کالج کے بعد یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران اور اب سی ایس ایس کے تحریری امتحان کی تیاری میں انہوں نے اس کی بھرپور مدد اور رہنمائی کی تھی اور کالج کی لیکچرار شپ کے تحریری امتحان اور انٹرویو کی ساری تیاری بھی اس نے انہی کی سرپرستی میں کی تھی۔ وہ ان کی دل سے عزت کرتا تھا اور بابا کے بعد وہ دوسرے فرد تھے جن کو وہ آئیڈیلائز کرتا تھا۔

پروفیسر اکرام ایک بارعب اور انتہائی ریزرو قسم کے انسان تھے۔ ان کا حلقہ احباب بے حد محدود تھا اور اپنے شاگردوں کے ساتھ تو لیکچرز کے ساتھ بھی وہ ایک مخصوص فاصلہ رکھ کر ملنے کے عادی تھے۔ لیکن حسن سے وہ خصوصی شفقت کا سلوک کرتے تھے۔ اس لیے وہ کبھی کبھار ان کے گھر بھی چلا جایا کرتا تھا۔ اس روز بھی چونکہ اس کے پاس ان کو سنانے کے لیے ایک بڑی خوشخبری تھی اس لیے وہ انہیں فون کرنے کی بجائے خود وہاں چلا آیا۔

اس کی کال بیل کے جواب میں دروازہ خود پروفیسر اکرام نے ہی کھولا تھا۔ حسن انہیں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ پروفیسر اکرام سے آخری بار چند ماہ پہلے ہی ملا تھا مگر تب کے اور اب کے پروفیسر اکرام میں زمین آسمان کا فرق پڑ چکا تھا۔ وہ ایک صحت مند اور خوش پوش قسم کے آدمی تھے۔ جن کی شخصیت بڑی بارعب اور دبنگ قسم کی تھی۔ مگر اس وقت حسن کے سامنے کھڑا شخص جیسے کوئی دوسرا ہی آدمی تھا۔ پروفیسر اکرام کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا اور ان کی رنگت اس قدر زرد ہو چکی تھی جیسے کسی نے ان کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ ان کی آنکھوں میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ اور وہ زندگی کی چمک سے بالکل عاری لگ رہی تھیں۔

"سر! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" حسن انہیں دیکھ کر ششدر تھا۔ اور شاک کے عالم میں پوچھ رہا تھا۔

پروفیسر اکرام کا چہرہ مزید ویران نظر آنے لگا۔ انہوں نے حسن کی بات کا فوری جواب نہیں دیا بلکہ وہ اسے اندر لائے اور جب وہ حیران پریشان سا ایک کرسی پر بیٹھ گیا تو اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے مردہ سی آواز میں بولے۔

"مجھے لیور کینسر ہے حسن! ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ میرا جگر بالکل ختم ہو چکا ہے اور میرے پاس زندہ رہنے کے لیے بہت تھوڑے دن بچے ہیں۔" ان کی بارعب اور گونج دار آواز کس قدر بدل چکی تھی۔ جیسے کسی اور کی آواز سن رہا تھا۔ دروازہ کھولنے اور کمرے تک واپس آنے کی مشقت سے ہی پروفیسر اکرام کا سانس تیز ہو گیا تھا اور ان کے جسم کی لرزش حسن کو صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اسے یہ سب کچھ ایک ڈراؤنا خواب لگ رہا

www.pkdigest.com

تھا۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا تھا اور اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کہ وہ کیا کہے۔ ایسا کیا بولے جس سے پروفیسر اکرام کو تسلی دے سکے یا کم از کم خود کو پہنچنے والے دکھ کو ہی واضح کر سکے۔ پروفیسر اکرام وہ شخصیت تھے جن سے اس نے آگے بڑھنا اور حاصل کرنا سیکھا تھا انھوں نے ہر قدم پر اس کی رہنمائی کی تھی اور اب زندگی انھیں اس مقام پر لے آئی تھی جہاں وہ بے بس اور لاچار نظر آ رہے تھے اور حسن ان سے زیادہ بے بسی محسوس کر رہا تھا کہ وہ اپنے آئیڈیل استاد کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بے بسی اور رنج کے مارے اس کی آنکھیں بھر آئیں وہ اپنی جگہ سے بے اختیار اٹھا اور پروفیسر اکرام کے قدموں میں جا بیٹھا۔

"سر!" ان کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں عقیدت سے تھامتے ہوئے وہ رو پڑا تھا۔

"مجھے بتایئے سر! میں آپ کے لیے کیا کروں؟"

اس کے لاشعور میں شدت سے یہ احساس موجود تھا کہ وہ ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ پھر بھی وہ پوچھ رہا تھا۔

"تم" پروفیسر اکرام کی بجھی ہوئی آنکھوں میں اچانک ہی چمک سی آ گئی۔ "کیا تم وہ کرو گے جو میں تم سے کہوں گا؟" وہ بڑی آس سے پوچھ رہے تھے۔

"جی سر میں کروں گا میں آپ کے لیے اپنی جان بھی دے دوں گا۔" اس نے بلاتوقف جواب دیا تھا۔ پروفیسر اکرام چند لمحوں تک پرخیال انداز سے اس کا چہرہ دیکھتے رہے پھر جھجکتے ہوئے بولے۔

"تم میری بیٹی نفیسہ سے شادی کر لو۔" حسن کے سر پر جیسے بم پھٹا تھا۔ وہ حیرت کے مارے کچھ بول ہی نہیں پایا۔ بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھے گیا۔

"تم یقین کرو بیٹا! مجھے اپنی موت کا ڈر نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے تو بس اپنی بیٹی کا اس کا میرے علاوہ اس دنیا میں کوئی نہیں جو میرے بعد اس کا خیال رکھ سکے۔ میری بڑی بیٹی شادی شدہ ہے وہ سرگودھا میں رہتی ہے مگر اس کا شوہر اچھا آدمی نہیں ہے۔ اس لیے نفیسہ وہاں کسی طور نہیں رہ سکتی۔ وہ بہت سیدھی اور معصوم ہے۔ مجھے ہر وقت اسی کا خیال رہتا ہے۔ کہ میرے بعد اس کا کیا ہو گا۔ وہ تو کسی سے اعتماد سے بات بھی نہیں کر سکتی یہ خوف مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتا کہ میری معصوم بن ماں کی بچی رل جائے گی۔ وہ تو کسی کی اونچی آواز سے بھی سہم جاتی ہے اور یہ دنیا بڑی ظالم ہے بیٹا! تمہیں اگر میرا ذرا سا بھی خیال ہے۔ تو نفیسہ سے شادی کر لو۔"

بات کرتے کرتے وہ نہ جانے کیا کیا سوچے جا رہے تھے جو ان کی آواز بھرانے لگی تھی۔ حسن گنگ بیٹھا ان کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس میں نہ ہاں کہنے کی ہمت تھی اور نہ ہی ناں کرنے کا حوصلہ وہ خود میں پا رہا تھا اس لیے لب سیے بیٹھا تھا۔

"مجھ پر یہ احسان کر دو بیٹا! میں سکون سے مر سکوں گا۔ تمہارے علاوہ کوئی نہیں جس پر میں بھروسہ کر سکوں۔" کہتے کہتے انھوں نے حسن کے آگے اپنے ہاتھ جوڑ دیے تھے حسن تڑپ اٹھا بے اختیار ہی اس نے ان کے ہاتھوں کو تھام لیا اور اپنی آنکھوں سے لگا کر بولا۔

"میں تیار ہوں سر! میں آپ کے حکم کے لیے تیار ہوں۔" اس کی آنکھوں کے آگے کئی عکس لہرا رہے تھے مگر وہ پروفیسر اکرام کو اب انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے جب بولا تو اس کا لہجہ بڑا اعتماد اور صاف تھا۔ پروفیسر اکرام کی بجھی ہوئی آنکھیں اس کے اس فقرے کو سن کر چمک اٹھی تھیں اور ان کے چہرے پر وحشت کی جگہ سکون نے لے لی تھی۔ حسن نے شدت سے ان میں آنے والی یہ تبدیلی محسوس کی اور اس کا فیصلہ مزید پختہ ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

ڈیڑھ ماہ کے بعد وہ گھر لوٹ کر آیا تو زندگی اس کے لیے مکمل طور پر بدل چکی تھی۔ پروفیسر اکرام کا کچھ روز پہلے انتقال ہو گیا تھا اور انھوں نے اپنی وفات سے پہلے نفیسہ اور حسن کا نکاح کروا دیا تھا۔ نفیسہ فی الحال لاہور میں حسن کے ایک کولیگ کے گھر پر تھی۔ پروفیسر اکرام نے اگرچہ اپنا گھر حسن کے نام کرنا چاہا تھا مگر حسن نے ان کو ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے احسان کا بار دل پر محسوس کر کے پروفیسر اکرام کوئی ایسا فیصلہ کریں جو غیر شرعی ہو۔ مکان اور نقد رقم یا جو کچھ بھی ان کے پاس تھا۔ اس پر ان کی دونوں بیٹیوں کا حق تھا اور وہ کسی کا بھی حق چھیننا نہیں چاہتا تھا۔ بعد میں جو حالات پیش آئے ان سے اسے اندازہ ہوا کہ اس کا یہ اقدام کس قدر درست تھا کیونکہ پروفیسر اکرام کی بڑی بیٹی کے شوہر نے ان کی نماز جنازہ کے فوراً بعد ان کے چھوڑے ہوئے ترکے میں سے اپنی بیوی کے حصے کا مطالبہ کر دیا تھا۔

اس کی بیوی ایک سہمی ہوئی اور بے بس سی عورت تھی اور ایک خاموش تماشائی کی طرح بیٹھی تھی۔ شاید اس میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ وہ اپنے شوہر کو کوئی رائے دے سکے یا کسی معاملے میں خود کوئی فیصلہ کر سکے۔ ان کے باقی رشتہ داروں میں سے بھی کوئی ایسا نہیں تھا جو ان یتیم ہو جانے والی بیٹیوں کے دکھ کو محسوس کرتا۔ خاص طور پر سہمی ہوئی نفیسہ سے کوئی بھی زیادہ بات نہیں کر رہا تھا۔ انہیں یہ غم تھا کہ اب وہ اکیلی رہ گئی ہے۔ اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ نفیسہ سے زیادہ ہمدردی جتائیں مبادا اسے اپنے گھر ہی رکھنا پڑ جائے۔

حسن خاموشی سے یہ ساری صورت حال دیکھ رہا تھا۔ اس کے اعصاب منجمد سے ہو چکے تھے۔ اور اسے یوں لگ رہا تھا کہ اس کی باقی کی زندگی اس منجمد حالت میں بسر ہو جائے گی۔ جو کچھ بھی ہوا اسے اگرچہ وہ تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر چکا تھا مگر اس کے اعصاب کو جو شدید جھٹکا پہنچا تھا وہ خود کو اس جھٹکے سے سنبھال نہیں پا رہا تھا۔ نفیسہ سے ابھی تک اس کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ مگر اپنے ہی گھر ایک اجنبی جگہ پر پھنس جانے والے بچے کی طرح ڈری سہمی نفیسہ پر اسے ترس بھی آ رہا تھا۔ وہ اسے دلاسا دینا چاہتا تھا مگر اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ اگر نفیسہ سے کوئی بات کرنا چاہے گا تو شاید لفظ اس کا ساتھ نہ دیں اس لیے خاموش بیٹھا تھا۔ البتہ نفیسہ کے بہنوئی کے شور شرابے نے اسے ضرور بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس شخص سے شدید چڑ محسوس ہونے کے باوجود صرف نفیسہ اور اس کی بہن کی خاطر حسن نے اسے یقین دہانی کروائی تھی کہ چند روز تک اسے اس کی بیوی کا پورا حصہ مل جائے گا۔

پروفیسر اکرام کا گھر فروخت کرواتے ہوئے اگرچہ اس کا دل دکھا تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کے اپنے پاس ابھی اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ نفیسہ کے بہنوئی کو ادائیگی کر کے مکان اپنے پاس رکھ سکتا۔ اس لیے مکان کے ساتھ ساتھ گھر کا کچھ سامان بھی فروخت کرنا پڑا تھا۔ نفیسہ اس تمام عرصے میں ایک بار بھی کچھ نہیں بولی تھی۔ وہ گوری رنگت اور کشادہ آنکھوں والی ایک خوب صورت مگر بے حد خاموش طبع اور دبو قسم کی لڑکی تھی۔ جو بات بات پر سہم جایا کرتی تھی پروفیسر اکرام نے اس کے بارے میں ٹھیک ہی سوچا تھا وہ ایسی لڑکی ہرگز نہیں ہو سکتی تھی جو دنیا والوں کے سخت رویوں کا سامنا کر سکتی۔

حسن نے اپنے گھر فون پر اس ساری صورت حال کے بارے میں بتا دیا تھا اور بعد میں اسے ماں جی، اباجی اور اپنے بھائی بہنوں سے اپنے اس قدم پر بہت کچھ سننا پڑا تھا۔ البتہ فرح یا بابا نے اس سے فون پر کوئی رابطہ نہیں کیا تھا اور نہ خود حسن کی ہمت ہوئی تھی کہ انہیں فون کر سکتا۔ اور اب وہ گھر لوٹ کر آیا تھا تو اپنے سگے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے رویے نے پہلے قدم پر ہی اس کی ہمت توڑ دی تھی۔ فون پر اگرچہ وہ سب ہی باری باری اسے اس کے اس اقدام پر بہت کچھ سنا چکے تھے اور وہ بہت ساری سخت باتیں سننے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کر بھی وہاں آیا تھا۔ مگر وہاں کی صورت حال اس کی سوچ سے برعکس تھی ان میں سے کسی نے بھی اسے کچھ نہیں کہا تھا۔ بس وہ لوگ اس سے یکدم ہی لاتعلق ہو گئے تھے۔ گھر کا کوئی بھی فرد اس سے بات نہیں کر رہا تھا۔ وہ ان میں سے کسی کے بھی پاس بیٹھ کر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کرتا تو اول تو وہ فرد اس

www.pkdigest.com

کی بات سنے بغیر ہی وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا اور اگر کسی وجہ سے نہ جایا جاتا تو حسن کی تمام باتوں کے دوران دوسری طرف ایسی لاتعلقی ہوتی جیسے اس کی باتیں سنائی ہی نہ دے رہی ہوں۔

یہ نئی صورت حال حسن کے لیے اس کی سوچ سے بھی بڑھ کر تکلیف دہ تھی۔ وہ گھر کا بڑا بیٹا تھا۔ ہمیشہ سے ماں باپ کا فرمانبردار رہا تھا اس لیے اسے ہمیشہ باقی بھائی بہنوں سے زیادہ چاہا گیا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ماں باپ کی آنکھوں کا تارا بن کر رہا تھا۔ پھر بہن بھائیوں سے بھی اس کی بہت دوستی تھی۔ وہ شروع ہی سے اپنی ساری فیملی سے بہت قریب رہا تھا۔ مگر اب جیسے کوئی بہت اونچی اور آہنی دیوار اس کے اور باقی سب کے درمیان میں حائل ہو گئی تھی جسے نہ وہ توڑ سکتا تھا اور نہ ہی پھلانگ سکتا تھا۔ بے بسی دکھ اور مایوسی تینوں کیفیات اس پر تمام وقت چھائی رہتی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا ہو۔ اس کے پورے وجود پر ایک سناٹا سا چھایا رہتا تھا۔ اور یہی سناٹا جیسے پورے گھر کو بھی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ وہ گھر جہاں کچھ ہفتے پہلے تک اس کی اور فرح کی شادی کی تیاریاں پورے زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ اب جیسے کسی ماتم کدے میں تبدیل ہو چکا تھا۔

وہ ایک ہفتے تک وہاں رہا اور اس نے اپنی انتہائی کوشش کر کے دیکھ لی مگر گھر کے کسی فرد نے اس کا ساتھ دینا تو در کنار اسے معاف تک نہیں کیا۔ اس کے ساتھ اس تمام عرصے میں صرف اس کی چھوٹی بہن ایک بار بولی تھی اور وہ بھی یہ کہنے کے لیے کہ ”حسن نفیسہ کو طلاق دے دے“ اور حسن کو اس کے یوں بولنے سے تکلیف ہوئی تھی۔ وہ اس تمام عرصے میں جیسی بھی اذیت میں رہا تھا اس نے نفیسہ کو چھوڑنے کا ایک بار بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ نفیسہ جیسی ڈرپوک لڑکی کو دنیا کے بے رحم سمندر میں بے دست و پا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ پروفیسر اکرام کے اپنے سامنے بندھے ہوئے ہاتھوں کو مرتے دم تک نہیں بھول سکتا تھا۔ وہ ان کے سامنے کیا ہوا عہد کسی صورت نہیں توڑ سکتا تھا۔ مگر یہ سب باتیں وہ اپنے گھر والوں کو نہیں سمجھا سکتا تھا۔ وہ انہیں نفیسہ کی آنکھوں میں بسا ہوا خوف دکھا سکتا تھا نہ پروفیسر اکرام کے بندھے ہوئے ہاتھ ان کے سامنے لا سکتا تھا۔ ان لوگوں کے لیے نفیسہ بس ایک ایسی لڑکی تھی جس نے ان کے گھر کی بنیادوں کو ہلا ڈالا تھا۔ جس نے فرح کے ہاتھوں کی مہندی اپنے ہاتھوں پر زبردستی لگالی تھی۔ انہیں نفیسہ سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ انہیں صرف فرح کا خیال تھا۔ صرف بابا کی پریشانی انہیں دکھی کر رہی تھی۔ پروفیسر اکرام کون تھے۔ ان کی کیا مجبوریاں تھیں۔ نفیسہ کیسے اس بندھن میں بندھ گئی۔ خود حسن نے کیسے بچپن کی چاہت کو پس پشت ڈال کر نفیسہ کا ہاتھ تھاما۔ ان میں سے کسی کو بھی اس بات سے سروکار نہیں تھا۔

اس ہفتے کے دوران فرح ایک بار بھی ان کے گھر نہیں آئی تھی۔ حسن کو پتا بھی تھا کہ وہ نہیں آئے گی مگر پھر بھی اسے اس کا انتظار رہا تھا۔ ہر آہٹ پر وہ چونک جایا کرتا تھا۔ بار بار اسے یوں لگتا تھا کہ ابھی وہ چھم سے سامنے آکر کھڑی ہو جائے گی اور منہ بنا کر کہے گی۔

”تم ہو ہی سدا کے وعدہ خلاف۔ کبھی بتائی ہوئی تاریخ پر واپس نہیں آتے ہو۔“ فرح کو ہمیشہ اس سے یہی گلہ ہوتا تھا کہ وہ جس تاریخ کو واپس آنے کا کہہ کر جاتا اس تاریخ سے ہمیشہ ہی لیٹ ہو جایا کرتا تھا۔

”اور اب۔۔۔؟“ وہ حسرت سے اپنے گھر کے داخلی دروازے کو دیکھتا۔

”اب تو میں بتائی ہوئی تاریخ سے بھی پہلے آگیا ہوں۔ اب تم کیوں ناراض ہو؟ کیوں نہیں آئی ہو؟“ اس کا دل رو دیتا تھا۔

وہ اس کی زندگی کے سب سے مشکل دن تھے۔ بچپن کی محبت کو کھو دینے کا دکھ تو جو تھا سو تھا۔ اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں نے اسے جس طرح خود سے دور کر دیا تھا۔ یہ تڑپ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ کبھی کبھی تو اس کا دل چاہتا کہ وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرلے یا کہیں بہت دور نکل جائے اور کبھی واپس نہ آئے مگر ایسے میں نفیسہ کی خوف سے بھری آنکھیں اور

پروفیسر اکرام کے بندھے ہوئے ہاتھ اس کے سامنے آجاتے اور وہ پھر جھری سی لے کر رہ جاتا۔

ایک ہفتے کے بعد جب اس نے واپسی کے لیے رخت سفر باندھا تو گھر کے افراد پہلے سے بھی بڑھ کر سخت ہو گئے ان میں سے پہلے کسی نے اسے روکنے یا واپس بلانے کی خاطر بھی بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف دیوار پر لگے کلاک کی ٹک ٹک تھی جو اس دبیز خاموشی میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ حسن بابا کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا اور بابا کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ اس کے پورے خاندان میں وہ واحد شخص تھے جنہوں نے حسن کو دیکھ کر منہ نہیں پھیرا تھا۔ اسے نفرت کی نظر سے نہیں دیکھا تھا اور اس کی بتائی ہوئی ساری باتیں بہت توجہ اور دھیان سے سنی تھیں۔ حسن کو اس تمام عرصے میں پہلی بار اپنا دل ہلکا ہوتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ بابا کو ساری باتیں تفصیل سے بتا کر وہ بلک بلک کر شاید زندگی میں پہلی بار اس طرح سے رویا تھا کہ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا تھا۔ بابا نے اسے چپ کروانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ حسن اپنے دل کا تمام غبار نکال لے اور ہلکا پھلکا ہو جائے۔

”مجھے بتائیں بابا! میں اس کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا جو میں نے کیا۔۔۔ کیا میں غلط تھا بابا؟“

بہت دیر کی خاموشی کے بعد وہ بچوں کی سی معصومیت سے پوچھ رہا تھا بابا کو اس پر بے اختیار ہی پیار آنے لگا۔ انہوں نے شفقت سے اس کا شانہ تھپکا اور نرمی سے بولے۔

”تم نے بالکل ٹھیک کیا ہے بیٹا! اگر تم اس سے ہٹ کے کچھ کرتے تو ساری عمر اپنے ضمیر کے مجرم رہتے۔ مجھے تم پر فخر ہے بیٹا! اللہ تعالیٰ تمہیں ثابت قدمی سے نوازے تاکہ تم اپنے استاد سے کیے ہوئے عہد کو پورا کر سکو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“

”بابا! آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں نا۔“ بہت مشکل سے وہ یہ سوال کر پایا تھا۔ بابا مسکرا دیے۔

”تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا حسن! تمہارے نکاح کی خبر سن کر مجھے قدرتی طور پر دکھ ہوا تھا۔ مگر اب سارے حالات سننے کے بعد میرا وہ دکھ بھی جاتا رہا ہے۔ تم نے بڑا کام کیا ہے بیٹا! تمہیں اس پر کبھی افسردہ نہیں ہونا چاہیے اور پھر جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔ فرح کے نصیب میں جس کا ساتھ ہوگا وہ اسے مل جائے گا۔“

وہ شفقت سے کہہ رہے تھے۔ ان کی آخری بات پر حسن کا دل شدت سے بے قرار ہونے لگا۔ فرح اس کی اولین چاہت اس کے بچپن کا پیار ”اسے پرایا ہوتا دیکھنے کا تصور ہی اس کے لیے سوہان روح تھا۔ اس کا دل بین کرنے لگا۔

”بابا! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں فرح سے بھی۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔“ بات ہی ایسی تھی کہ بابا کے سامنے وہ کوشش کر کے بھی مکمل نہ کر سکا۔ لیکن بابا اس کے ادھورے لفظوں سے ہی اس کا مافی الضمیر سمجھ چکے تھے ان کے چہرے پر سنجیدگی گہری ہو گئی۔

”یہ نہیں بیٹا! اس سلسلے میں میں کچھ خود سے کہہ نہیں سکتا۔ فرح اس بارے میں کیا سوچے گی کیا فیصلہ کرے گی میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کیونکہ محبت کا بٹوارہ آسان نہیں ہوتا۔“ بابا سوچتے ہوئے بول رہے تھے جب کمرے کے بیچ والے دروازے پر گلابی آنچل لہرایا حسن سر اٹھائے بغیر بھی جان چکا تھا کہ وہاں فرح کھڑی ہے۔

”میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی بابا! اور نہ ہی مجھے ایسا کرنے کو کہا جائے۔“ بہت مضبوط لہجے میں ایک فقرہ بول کر وہ واپس جا چکی تھی حسن نے اپنے سارے وجود کو پتھر ہوتا ہوا محسوس کیا۔

”چلتا ہوں بابا! صبح لاہور کے لیے نکلنا ہے۔“ اسے اپنی آواز اجنبی لگی تھی اس نے اپنے پتھر کے وجود کو

www.pkdigest.com

کو تو ... اور حسن کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی

طرف بڑھ گیا۔ بابا اس کے ساتھ ہی اٹھے تھے برآمدے میں پہنچ کر انہوں نے اسے گلے سے لگایا اور محبت سے بولے۔

"صبح میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ میں خود اپنی بہو کو رخصت کروا کر لاؤں گا۔ تم خود کو بھی تنہا مت سمجھنا حسن! آج سے تم میرے بیٹے ہو۔"

"شکریہ بابا!" اس کی آنکھیں ایک بار پھر بھر آئیں۔ بابا اس کا شانہ تھپک کر واپس اندر چلے گئے مگر حسن وہیں کھڑا کشادہ صحن کو دیکھتا اور آنسو بہاتا رہا۔ اس کا دل ایک بار پھر بے طرح بوجھل ہونے لگا۔ اس نے گہری سانس لے کر اپنے بوجھل دل کو پرسکون کرنا چاہا مگر ایسا کرنے سے دل پر دھرا بوجھ کچھ اور بڑھ گیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ بھاگتا ہوا اندر جائے اور بابا کے سینے سے لگ کر کہے کہ وہ کسی بھی طرح فرح کو منالیں اسے فرح کے بغیر زندگی کا تصور ہی بھیانک لگ رہا تھا۔

شدید جذباتی ہیجان کا شکار ہو کر وہ واپس دروازے کی طرف مڑا تھا مگر اس لمحے کمرے کے اندر سے آتی فرح کی آواز نے اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا۔

"بابا! اگر میں اس سے شادی کر لیتی ہوں تو آپ جانتے ہیں کہ وہ کبھی بھی نفیسہ سے انصاف نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ وہ بچپن ہی سے مجھ سے پیار کرتا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ اس نے جو نیکی کی ہے وہ ضائع ہو جائے۔ اور پھر وہ لڑکی اس کا بھلا اس سارے قصے میں کیا قصور ہے۔ میرے پاس تو آپ ہیں باقی سب لوگ ہیں۔ مگر اس کے پاس تو صرف حسن ہے اگر میں نے اس سے حسن کو بھی چھین لیا تو وہ کیا کرے گی کیسے زندہ رہے گی۔ بابا! آپ اس کو میری جگہ رکھ کر کیوں نہیں سوچتے اسے اپنی بیٹی کیوں نہیں سمجھتے۔"

وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ حسن کے قدم پتھر کے ہو گئے۔ فرح رو رہی تھی۔ وہ نفیسہ کے لیے رو رہی تھی۔ اس نفیسہ کے لیے۔ جس نے اس کی جگہ پر قبضہ کیا تھا۔ اگر نفیسہ حسن کی زندگی میں نہ آئی ہوتی پھر بھی فرح اس کے لیے سوچ رہی تھی۔ کس قدر اعلا ظرف تھی وہ۔ حسن کو اپنا آپ اس کی عظمت کے سامنے بونا سا لگا۔ وہ آہستگی سے پلٹا اور کشادہ صحن سے گزرتا ہوا فرح کے گھر سے باہر نکل گیا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

☼ ☼ ☼

بابا اگلے روز اپنے وعدے کے مطابق اس کے ساتھ لاہور آئے تھے۔ نفیسہ ابھی حسن کے دوست کے گھر پر ہی تھی۔ بابا اس سے وہیں جا کر ملے۔

"خود کو کبھی تنہا مت سمجھنا بیٹا! آج سے تم میری بیٹی ہو۔" اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے شفقت سے کہا تو نفیسہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ بہت مشکل سے اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ بابا اگلے کچھ دن لاہور میں ہی رہے انہوں نے ہی تگ و دو کر کے حسن کے کالج کے نزدیک ایک کرائے کا مکان حاصل کیا اور پھر جب مکان کے لیے ضروری خریداری کا مرحلہ آیا تو نفیسہ نے بہت خاموشی سے ایک بڑی رقم کا چیک کاٹ کر بابا کے ہاتھ میں لا تھمایا۔ بابا اور حسن دونوں ہی یہ چیک دیکھ کر حیرت زدہ ہوئے تھے۔ کیونکہ صرف حسن کو معلوم تھا کہ یہ رقم وہ ہے جو پروفیسر اکرام کا مکان اور دیگر املاک فروخت کرنے کے بعد نفیسہ کے حصے میں آئی تھی۔ خود حسن نے ہی یہ رقم بینک میں جمع کروائی تھی۔ بابا سے پہلے اس نے حسن کو یہ چیک دینا چاہا تھا مگر حسن نے اسے لینے سے انکار کر دیا تھا۔

"یہ تمہاری رقم ہے۔ اسے اپنے پاس سنبھال کر رکھو۔ میں تم سے یہ پیسے نہیں لے سکتا۔ گھر کے تمام اخراجات پورے کرنا میری ذمہ داری ہے تمہاری نہیں۔" اس نے نرمی سے کہا تھا۔ ان کے نکاح کو مہینہ ہو چکا تھا اور اس تمام عرصے میں حسن نے پہلی بار اس سے اتنی لمبی بات کی تھی۔ نفیسہ نے مزید کچھ نہیں کہا۔ بس جب بابا گھر آئے تو وہ چیک ان کے سامنے لا رکھا۔

"بابا! آپ نے کہا تھا کہ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ اگر میرے پاپا زندہ ہوتے تو وہ اس رقم سے میرے لیے جہیز بناتے اب وہ نہیں ہیں۔ تو میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ آپ ان پیسوں سے وہ سب کچھ مجھے خرید کر دیں۔ جو میرے پاپا خرید کر دیتے۔" رندھے ہوئے گلے کے ساتھ وہ نظریں جھکائے بول رہی تھی۔ بابا کو اسے انکار کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔

"جیسا تم چاہو گی بیٹا! ویسا ہی ہو گا۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ نفیسہ پلٹ کر اندر چلی گئی۔ بعد میں بابا نے ہی حسن سے بھی بات کی اور حسن نے بابا کے سامنے انکار نہیں کیا تھا۔

ایک ہفتے تک بابا نے حسن کے ساتھ ساری خریداری کر کے ان کا گھر مکمل طور پر سیٹ کروا دیا تھا بلکہ چند ایک بار وہ نفیسہ کو مختلف چیزیں پسند کروانے اپنے ساتھ بھی لے گئے تھے۔ گھر کی تمام ضروری چیزیں لینے کے بعد بھی خاصی رقم بچ گئی تھی۔ جس میں سے کچھ انہوں نے واپس نفیسہ کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دی اور کچھ کا اس کے لیے زیور خرید دیا۔

ڈیڑھ ہفتہ لاہور میں رہنے کے بعد بابا واپس گاؤں چلے گئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے حسن سے بطور خاص نفیسہ کا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی۔

"یہ میری بیٹی ہے حسن! اسے کبھی دکھ نہ دینا۔ اگر تم نے کبھی اسے دکھی کیا تو سمجھ لینا کہ مجھے دکھی کرو گے۔ یہ میری دوسری فرح ہے۔"

اسے نفیسہ کا خیال رکھنے کی اور مضبوط بن کر رہنے کی بہت ساری تاکیدیں کر کے بابا واپس گاؤں چلے گئے تھے۔ مگر اس کے بعد وہ جتنا عرصہ بھی زندہ رہے۔ برابر ان کے پاس ملنے کے لیے آتے رہے۔ انہوں نے نفیسہ کو بیٹی صرف کہا ہی نہیں تھا بلکہ سمجھا بھی تھا اس لیے ہر اہم موقعے پر وہ ایک باپ کی طرح ذمہ داریاں پوری کرتے رہے۔

حسن کی شادی کے ایک سال بعد ہی انہوں نے فرح کی شادی اپنے ایک پرانے دوست کے بیٹے سے کر دی۔ جو جدہ میں ملازمت کر رہا تھا۔ اگرچہ حسن کے والدین نے بہت چاہا تھا کہ وہ فرح کی شادی حسن کے چھوٹے بھائی کے ساتھ کرنے کے لیے رضامند ہو جائیں مگر بابا اور خود فرح بھی اس کے لیے تیار نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ ان دونوں کو ہی اس بات کا احساس تھا کہ اگر فرح اس گھر میں دلہن بن کر گئی تو حسن کا دوبارہ وہاں آنا جانا ممکن نہیں ہو سکے گا۔

فرح نے اپنی شادی سے ایک روز پہلے بابا سے اجازت لے کر حسن کو فون کیا تھا۔

"میں نے تم سے ہمیشہ بہت محبت کی ہے حسن! اپنے سے پہلے تمہارے لیے دعائیں مانگتی رہی ہوں۔ ہمارا ساتھ قسمت میں نہیں تھا۔ مگر مجھے پورا یقین ہے کہ جو کچھ بھی ہوا ہمارے لیے وہی بہتر تھا۔ کیونکہ یہ تقدیر کا فیصلہ تھا۔ تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ اس ساتھ کو ہمیشہ نبھانا اور اپنی بیوی کا خیال رکھنا۔ میری کل شادی ہے۔ اور کچھ دنوں کے بعد میں ملک سے باہر چلی جاؤں گی۔ آج کے بعد میں تمہیں یاد نہیں کروں گی اور اگر کبھی کروں گی تو صرف ایک کزن یا ایک دوست کی حیثیت سے تاکہ اپنی آئندہ زندگی میں اس شخص کے ساتھ ایماندار بن کر رہ سکوں۔ جس کا جوڑ اللہ نے میرے ساتھ بنایا ہے۔ تمہیں فون اس لیے کیا ہے تاکہ تمہیں یہ یقین دلا سکوں کہ میرے دل میں تمہارے لیے رتی بھر بھی غصہ یا خفگی نہیں ہے۔ میں آج ہمیشہ سے زیادہ تمہاری عزت کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی رہوں گی۔"

فرح کا لہجہ ہمیشہ والا شوخ اور لاپروا نہیں تھا۔ وہ آج بہت سنجیدگی سے بول رہی تھی۔ شاید گزرے ہوئے سولہ مہینوں نے اس کی چنچل شخصیت کو سنجیدگی کا لبادہ اوڑھا دیا تھا۔ یا پھر صرف حسن سے بات کرتے ہوئے ہی وہ اس قدر سنجیدہ ہو رہی تھی۔

"اللہ تعالیٰ تمہیں بہت ساری خوشیوں سے نوازے اور تم بہت خوشگوار زندگی گزارو۔" حسن نے بہت دل سے اسے دعا دی تھی۔

"شکریہ۔" وہ شاید مسکرائی تھی۔ "اپنی بیوی سے بات نہیں کرواؤ گے۔" حسن نے نفیسہ کو آواز دے

www.pkdigest.com

کر بلایا اور ریسیور اس کے ہاتھ میں تھما کر وہاں سے چلا گیا۔ فرح نے نفیسہ سے کیا بات کی یا نفیسہ نے اس سے کیا کہا۔ حسن نے بھی اس بارے میں نہیں پوچھا اور اس روز کے بعد اس نے فرح کو یاد کرنا بھی بڑی حد تک چھوڑ دیا۔ اب اگر وہ اسے یاد آتی تو وہ دانستہ اپنا دھیان کسی اور طرف لگانے کی کوشش کرتا۔ ابتدا میں اسے ایسا کرنے میں ذرا مشکل پیش آتی تھی پھر دھیرے دھیرے یہ کام بھی آسان ہوتا چلا گیا اور کچھ گزرتا ہوا وقت بھی یادوں کے نقوش کو دھندلانے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کی شادی کو سوا دو سال کا عرصہ گزرا تھا جب اللہ نے انہیں اولاد کی نعمت سے نوازا۔ تب تک بابا کی کوششوں سے اس کے والدین اور بہن بھائی اس سے ملنا شروع کر چکے تھے۔ مگر درمیان میں گزرا وقت حسن کو اس کی اپنی ذات میں اس قدر تنہا کر گیا تھا کہ وہ دوبارہ ان سب کے ساتھ ویسا نہیں بن سکا جیسا ڈھائی سال پہلے ہوا کرتا تھا کم گو تو خیر وہ ہمیشہ ہی سے تھا۔ مگر اب اس کی یہ عادت بن چکی تھی کہ انتہائی ضرورت کے علاوہ منہ سے کوئی لفظ نکلتا ہی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ اپنی بیوی کے ساتھ بھی وہ زیادہ بات نہیں کرتا تھا اور نفیسہ کی ناٹپ بھی ایسی نہیں تھی کہ وہ خود آگے بڑھ کر اپنا حق مانگتی۔ باپ کی اچانک بیماری اور موت نے اس کی شخصیت پر بہت گہرا اثر چھوڑا تھا۔ اسے ہمہ وقت دنیا کی بھیڑ میں تنہا رہ جانے کا خوف لاحق رہتا تھا۔ اس لیے وہ حسن کے سامنے بھی ہمیشہ ڈری سہمی سی رہتی تھی۔ اس کے لاشعور میں یہ خوف بیٹھ چکا تھا کہ اگر کبھی حسن نے اسے چھوڑ دیا تو وہ کیسے رہے گی اس لیے حسن کے ماتھے پر پڑنے والا ایک بل بھی اسے خوف زدہ کر دیا کرتا تھا اور وہ ہر اس کام سے فوراً" رک جاتی تھی جس کے لیے اسے ہلکا سا شک بھی گزرتا کہ حسن اس کو پسند نہیں کرے گا۔

حسن نفیسہ کے اس خوف کو ایک حد تک سمجھتا بھی تھا مگر اس نے نہ تو کبھی گہرائی میں جا کر اس خوف کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی اسے دور کرنا ضروری سمجھا تھا۔ بلکہ وہ تو اپنی ذات سے متعلقہ ان سارے خوابوں سے بھی دستبردار ہو چکا تھا جو ایک عمر تک اس کا اوڑھنا بچھونا رہ چکے تھے۔ سی ایس ایس کا تحریری امتحان اگرچہ اس نے پاس کر لیا تھا مگر اس بار انٹرویو وہ دے ہی نہیں پایا تھا اور دوسری بار بابا کے کہنے کے باوجود اس نے امتحان ہی نہیں دیا تھا۔

اس کی دنیا بس اب کالج، گھر اور کتابوں تک ہی محدود رہ گئی تھی۔ بلکہ گھر میں بھی اس کے ہونے کا احساس بہت کم ہوا کرتا تھا کیونکہ وہ گھر پر ہوتا تو بھی سارا وقت خاموش بیٹھا کتابیں پڑھتا رہتا۔

جس روز اسے اپنے بیٹے کی پیدائش کی خوشخبری ملی اس روز اس نے عرصے کے بعد کچھ خوشی محسوس کی تھی۔ ہاسپٹل کے کاریڈور میں ننھے خضر کو اپنے بازوؤں میں اٹھاتے ہوئے اسے ایک انجانی مضبوطی کا احساس ہوا تھا۔ اسے بہت دنوں کے بعد یہ لگا تھا کہ اب وہ تنہا نہیں رہا۔ اس کے بہن بھائیوں نے گہری دوستی کے بعد جس طرح اسے خود سے الگ کیا تھا۔ وہ احساس اس کی پوری شخصیت کو بدل کر رکھ گیا تھا۔ وہ اندر سے ایک تنہا اور آزردہ شخص بن چکا تھا۔ مگر اب خضر کی آمد نے اسے تنہائی اور آزردگی کو یکدم ہی ختم کر دیا تھا۔

اگلے بہت سارے دن وہ اس احساس سے خوشی محسوس کرتا رہا کہ اس کا بھی کوئی اپنا ہے۔ مگر اس کا یہ احساس بہت دیرپا ثابت نہیں ہو سکا تھا کیونکہ خضر کی پیدائش کے کچھ مہینوں بعد ہی اسے یہ خوف لاحق ہو گیا تھا کہ اگر بڑے ہونے کے بعد خضر نے بھی اس کے ساتھ وہی کیا جو پہلے اس کے گھر والے اس کے ساتھ کر چکے ہیں۔ تو وہ کیا کرے گا۔ وہ دوبارہ ٹوٹ کر بکھرنا اور نئے سرے سے خود کو جوڑنے کی کوشش کرنا اب اسے اپنے لیے ایک ناممکن عمل لگ رہا تھا۔ اس لیے وہ بہت خاموشی سے واپس اسی خول میں سمٹ گیا۔ جس میں سے خضر کی آمد کے وقت نکلا تھا۔ حتیٰ

کہ بعد میں ناصر، نائمہ اور خرم کی آمد بھی اس مضبوط خول کو نہ توڑ سکی اور زندگی کے بہت سارے سال یونہی گزر گئے۔

☼ ☼ ☼

حال سے ماضی اور ماضی سے واپس حال تک کا سفر چند منٹ کا تھا مگر انہیں نڈھال سا کر گیا تھا۔ حالانکہ اس سفر پر وہ پہلی بار نہیں گئے تھے۔ اکثر ہی جاتے رہتے تھے مگر آج سے پہلے انہوں نے اپنے ہر عمل میں خود کو حق بجانب سمجھا تھا آج پہلی بار انہوں نے اس احساس کے ساتھ ماضی کے اوراق پلٹے تھے کہ انہوں نے جو محبتوں کی بے اعتنائی سے ڈر کر خود کو ایک خول میں مقید کر کے رکھا تھا اور اپنی ذات میں تنہا رہنے کو ترجیح دی تھی تو ان کا یہ فیصلہ صرف ان کے لیے ہی نہیں ان کے ارد گرد موجود لوگوں کے لیے بھی اچھا ثابت نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ ان کے اس فیصلے نے ان کے گھر پر ایک نامحسوس سے خوف اور اجنبیت کی فضا طاری کیے رکھی تھی۔ وہ خود بھی تنہائی کا شکار رہے تھے اور ان کے بچے بھی اس اعتماد سے محروم رہے تھے جو انہیں صرف ان کی توجہ اور محبت سے ہی حاصل ہو سکتا تھا۔

"ابا جی! آپ کی چائے تو ٹھنڈی ہو گئی۔ آپ نے پی نہیں۔" نائمہ کی آواز ان کے قریب سے ابھری تھی۔ انہوں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ کتنے سالوں سے وہ ہر روز اسے دیکھتے آ رہے تھے۔ لیکن انہوں نے آج تک کبھی اسے پاس بٹھا کر دو محبت بھری باتیں اس سے نہ کی تھیں۔ پھر بھی وہ ہمیشہ بہت ادب اور محبت سے نظریں جھکا کر ان سے بات کرتی تھی۔ انہیں اس پر بے طرح پیار آیا تھا۔

"ہاں بیٹا! مجھے خیال نہیں رہا دوبارہ سے لا دو۔" وہ بہت شفقت اور نرمی سے بولے تھے۔ نائمہ نے سر ہلا کر ٹیبل سے کپ اٹھایا اور جانے کے لیے مڑ گئی۔

"ہاں سنو بیٹا۔" انہوں نے پیچھے سے پکارا۔

"چائے تم خود بنانا" میں بھی تو دیکھوں میری بیٹی کیسی چائے بناتی ہے۔"

"جی ابا جی۔" نائمہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ انہیں حیرت سی ہونے لگی بیٹی کے چہرے پر چھلکنے والی خوشی نے خود ان کے دل کو بھی خوشی سے بھر دیا تھا اور کچھ دیر پہلے جو ان پر آزردگی طاری تھی وہ یکدم ہی کہیں غائب ہو گئی تھی۔ انہوں نے خود کو بہت تازہ دم اور مطمئن سا محسوس کیا اور خود بخود ہی ان کے چہرے پر ایک پرعزم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"جو وقت گزر گیا سو گزر گیا۔ مگر اپنے آنے والے کل میں مجھے اپنی ہر غلطی کی تلافی کرنی ہے اور مجھے

www.pkdigest.com

شائع ہو گئے ہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو	راحت جبیں	قیمت: 225 روپے
☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	قیمت: 500 روپے
☆ محبت بیاں نہیں	لبنیٰ جدون	قیمت: 250 روپے

خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

یقین ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" ایک طویل عرصے کے بعد وہ اس طرح سے سوچ رہے تھے اور ایک طویل عرصے کے بعد ہی انہیں اپنے اردگرد روشنی سی پھیلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں نے دل ہی دل میں ماہ نور کو ڈھیر ساری دعائیں دے ڈالیں۔ جس نے بہت ہی نامحسوس انداز سے انہیں ان کی غلطی کا احساس دلایا تھا۔

☼ ☼ ☼

ابا جی کا رویہ کیا بدلا گھر بھر میں جیسے خوشی کی لہر سی دوڑ گئی تھی ہر شخص بے حد مطمئن اور سرشار سا نظر آنے لگا تھا امی جان کو وہ خود ایک اچھے فزیو تھراپسٹ کے پاس لے کر گئے تھے۔ اور اس کے علاج سے وہ تیزی سے روبہ صحت تھیں۔ ناصر دبئی میں تھا اور اب ابا جی ہر ہفتے خود اسے فون کر کے اس کی خیریت دریافت کرتے اور اس کے کام کے سلسلے میں اسے مشورے دیا کرتے تھے۔ اب وہ رات گئے تک اپنی بیٹھک میں بھی نہیں بیٹھتے تھے بلکہ کالج سے آنے کے بعد کا سارا وقت وہ گھر کے باقی افراد کے ساتھ گزارنے لگے تھے اور پہلی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ وہ نا صرف ان کی ساری باتیں توجہ سے سننے لگے تھے بلکہ خود بھی مختلف معاملات میں اظہار خیال کرنے لگے تھے۔

ان کا یہ انداز سب کے لیے ہی خوشی کا باعث تھا مگر امی جان خاص طور پر بہت خوش رہنے لگی تھیں۔

ان سب کو خوش دیکھ کر ابا جی کو خود بھی بہت مسرت کا احساس ہوتا تھا مگر کبھی کبھی انہیں احساس جرم بھی ہوتا تھا کہ اتنے سال تک انہوں نے ان سب کو حقیقی خوشیوں سے دور رکھا تھا اور صرف اپنے رویے سے گھر کی فضا میں خوف پھیلائے رکھا تھا۔

جب کبھی انہیں ایسا احساس ہوتا ان کے چہرے پر اداسی سی چھا جاتی اور وہ چپ سے ہو جایا کرتے تھے۔ ایسے میں ماہ نور بہت غور سے ان کی طرف دیکھا کرتی تھی۔ آخر ایک دن اس نے ابا جی سے ان کی اداسی کا سبب پوچھ ہی لیا۔

"بس بیٹا! مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں نے نفیسہ اور بچوں کو اپنی محبت سے محروم رکھ کر اچھا نہیں کیا۔" ابا جی نے افسردہ سے لہجے میں کہا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ بڑے کمرے میں اس وقت ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ ورنہ جب سے ابا جی نے وہاں بیٹھنا شروع کیا تھا۔ باقی سب بھی دن کا بیشتر حصہ وہیں براجمان رہنے لگے تھے۔

"یہ آپ سے کس نے کہا ابا جی! کہ آپ نے انہیں اپنی محبت سے محروم رکھا ہے۔ اگر آپ ان سے محبت نہ کرتے تو ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے انہیں سکھ پہنچانے کے لیے ساری زندگی محنت کیوں کرتے۔ ٹیوشنز پڑھا پڑھا کر ان کے لیے یہ گھر کیوں بناتے۔ آپ نے سب سے بہت محبت کی ہے ابا جی! صرف آپ نے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا مگر آپ کی محبت آپ کے ہر عمل سے ثابت ہوتی ہے اور آپ یقین کریں گھر کے ہر فرد کو آپ کی محبت کا احساس ہے۔ وہ [illegible] سے اب شکایت نہیں کرتے کہ آپ نے ان کو اپنی محبت سے محروم رکھا ہے۔ وہ سب آپ سے بہت خوش ہیں۔ بہت زیادہ۔"

وہ اپنے مخصوص لہجے میں بہت نرمی اور محبت سے کہہ رہی تھی اور ابا جی کو خود بخود اس کے لفظوں کی سچائی پر یقین آ رہا تھا۔

"ماہ نور! تم واقعی اسم بامسمیٰ ہو۔ تم اس گھر کے لیے اجالا بن کر آئی ہو۔ اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔" انہوں نے بہت دل سے اسے دعا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کے نو بجے کا وقت تھا۔ باہر تیز سرد ہوا کے ساتھ ہلکی ہلکی بوندا باندی کا عمل بھی جاری تھا۔ جس نے سردی کی شدت میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ مگر گھر کے اندر وسیع و عریض ٹی وی لاؤنج میں جہاں اس وقت گھر کے تقریباً سبھی افراد جمع تھے۔ بڑی خوشگوار سی

www.pkdigest.com

حدت تھی اور ماحول بھی بڑا خوشگوار تھا۔ وہاں اس وقت تین دن کے بعد ہونے والی نائمہ کی شادی کے بارے میں ہی باتیں ہو رہی تھیں۔ جس میں شرکت کرنے کے لیے ناصر پورے تین سال کے بعد ایک روز پہلے ہی پاکستان آیا تھا۔

اور اس وقت وہ امی جان کی گود میں سر رکھے صوفے پر لیٹا ہوا تھا اور امی جان بڑی محبت سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھیں سامنے والے صوفے پر بیٹھے ابا جی بہت پیار سے ماں بیٹے کے پیار کا مظاہرہ دیکھ رہے تھے۔ نائمہ کچن میں سب کے لیے چائے بنا رہی تھی اور خرم خضر کے کندھے سے لگا ہوا نہ جانے کون کون سے قصے سنا رہا تھا۔

"تو بھی آ گیا میرا شیر۔" ماہ نور اپنے ڈیڑھ برس کے بیٹے کو گود میں لیے سیڑھیاں اترتی دکھائی دی تو ان دونوں کو دیکھتے ہی ابا جی نے چہک کر کہا۔ ننھے عزیر میں ابا جی کی جان تھی۔ اور وہ بھی ابا جی کو دیکھتے ہی ان کی طرف ہمکنے لگتا تھا۔ جب تک ابا جی سامنے ہوتے تو وہ ماہ نور کو بھی لفٹ نہیں کرواتا تھا۔

"سنبھالئے اپنا شیر!" عزیر کو ابا جی کی گود میں بٹھا کر وہ نیچے کارپٹ پر بیٹھ گئی اور نائمہ کی شادی کے لیے سیمپل کے طور پر لائے ہوئے کارڈز دیکھنے لگی۔

"ابا جی! میں ایک بات سوچ رہی تھی۔" ایک فیروزی رنگ کے کارڈ کو بغور دیکھتے ہوئے اس نے کہا ابا جی نے عزیر کے ساتھ کھیلتے ہوئے ذرا سی توجہ اس کی طرف کی تھی۔

"کیوں نہ ہم نائمہ کے ساتھ ہی ناصر کی شادی بھی کر دیں۔"

"ہاں ناصر بھائی کی شادی بھی ساتھ ہی کر دیں بڑا مزا آئے گا۔ پھر میری باری بھی جلدی آ جائے گی۔" سب سے پہلے چودہ سالہ خرم نے چہک کر تبصرہ کیا تھا۔

"اور دو شادیاں ایک ساتھ کر دینے سے خرچ بھی بچے گا۔" خضر نے بھی بات مذاق میں اڑائی تھی۔ مگر ابا جی ماہ نور کی بات پر سوچ میں پڑ گئے تھے۔

"بات تو تم نے بڑی اچھی کہی ہے بیٹا! مگر اتنی جلدی یہ سب کیسے ہو گا۔ ہم نے تو اس کے لیے لڑکی بھی ابھی تک تلاش نہیں کی۔"

کچھ دیر کے بعد ابا جی بولے تو صاف پتا چل رہا تھا کہ دل سے وہ اس کام کے لیے رضامند ہیں۔ اور ان کی اس رضامندی نے سبھی کو اس معاملے میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

"لڑکی ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے۔ خالہ جان کی حمیرا ہے نا۔ اگر ناصر کو اعتراض نہ ہو تو۔" ماہ نور جیسے سارا کچھ طے کر کے ہی یہ بات کر رہی تھی۔ امی جان نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا مگر اس بات پر چونکیں نہیں کہ اس نے کیسے ان کے دل کی خواہش کو جان لیا ہے۔ عرصہ ہوا انہوں نے ماہ نور کی باتوں پر چونکنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ صرف انہی کی نہیں سبھی کی خواہشوں اور سوچوں کو بڑی اچھی طرح اور بڑی جلدی سمجھ جایا کرتی تھی اور اپنے فطری خلوص کی وجہ سے وہ سب کے لیے ہی خوشیاں تلاش کرتی رہتی تھی۔

"مجھے بھلا کیا اعتراض ہو گا بھابھی! میں ایک مشرقی لڑکا ہوں۔ خضر بھائی کی طرح ایڈوانس نہیں ہوں۔" ناصر نے شرارت سے کہہ کر امی جان کی گود میں چہرہ چھپا لیا تھا۔ اس کی بات پر خضر نے اسے گھور کر دیکھا تھا اور باقی سب ہنس دیے تھے۔

"چلو ٹھیک ہے اگر تم اتنے ہی مشرقی ہو تو میں حمیرا کی بجائے کوئی اور لڑکی تمہارے لیے دیکھ لیتی ہوں۔" ماہ نور کچھ عرصہ قبل محض اتفاق سے حمیرا کے لیے ناصر کی پسندیدگی سے واقف ہو چکی تھی اس لیے بڑی سنجیدگی سے بولی۔

"نہیں بھابھی۔" ناصر گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ "اب میں اتنا بھی مشرقی نہیں ہوں۔" اس نے بے ساختہ کہا تھا۔ جس پر سب کے قہقہے ابل پڑے اور ناصر جھینپ کر ایک بار پھر امی جان کی گود میں سر چھپا گیا۔

☼ ☼